جلد ۱۰۵ جولائی ۱۹۸۶ء عدد ۵

ماہنامہ

ترجمان القرآن

مؤسس

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی رحمہ اللہ تعالیٰ

ادارۂ ترجمان القرآن، اچھرہ، لاہور

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ کی شہرہ آفاق تصنیف

تفہیم القرآن

کے مختلف موضوعات کو الگ الگ کتابی شکل میں شائع کیا جا رہا ہے

انسان

کے موضوع کو الگ کتابی شکل میں شائع کر دیا گیا ہے۔

آئندہ آنے والا موضوع

آخرت

خواہشمند کرم فرما دفتر سے رجوع کریں

ترجمان القرآن لاہور

فہرست مضامین

جلد ۱۰۵ | جولائی ۱۹۸۶ء مطابق ذیقعدہ ۱۴۰۶ھ | عدد ۵

ماہنامہ ترجمان القرآن لاہور

۵۔ اے ذیلدار پارک، اچھرہ لاہور

زرسالانہ تیس روپے۔ فی پرچہ ۳/- روپے

سید حسین فاروق مودودی نے ایس فاروق ایسوسی ایٹس لمیٹڈ لاہور سے چھپوا کر دفتر ترجمان القرآن اچھرہ لاہور سے شائع کیا

الشیخ عمر تلمسانی جُدا ہو گئے

الشیخ، السید عمر تلمسانی ۲۲ مئی کو مسلمانانِ عالم سے جدا ہو گئے۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَ اِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن۔ شیخ کے اسلاف کا وطن الجزائر کا شہر تلمسان تھا۔ وہاں سے خاندان نے ۱۸۳۰ء میں مصر کی طرف ہجرت کی۔

شیخ تلمسانی ۴ نومبر ۱۹۰۴ء کو پیدا ہوئے۔ ۱۹۲۴ء میں آرٹس میں بی اے کیا۔ پھر لاء کا امتحان پاس کر کے وکالت شروع کر دی۔

۱۹۳۳ء میں امام حسن البنا کے ہاتھ پہ بیعت کی۔

وکالت ترک کی۔ اخوان المسلمون کے پروگرام میں محو ہو گئے۔ ۱۹۴۸ء میں اخوان نے اسرائیل کے خلاف جہاد کا اعلان کیا جس میں جناب عمر تلمسانی نے بھی شرکت کی۔ اسی جرم کا پس منظر تھا کہ جس کی وجہ سے الاخوان کو خلاف قانون قرار دے دیا گیا۔ عبدالہادی پاشا کی حکومت نے دوسرے اخوانوں کے ساتھ عمر تلمسانی کو بھی جیل میں ڈال دیا۔ جیل میں بہت سختیاں کی گئیں۔ ۱۹۵۱ء میں رہائی ملی۔

اس دور کی تاریخ مصر کے سیاہ ترین دور یعنی ۱۹۵۴ء تا ۱۹۷۱ء کے آغاز ہی میں عمر تلمسانی گرفتار کیے گئے۔ انہوں نے سخت عقوبتیں اٹھائیں۔ تازیانے کھائے اور پتھر کاٹے۔

امام حسن الھضیبی کی وفات کے بعد ان کو اخوان کا مرشدِ عام بنایا گیا۔

جب کیمپ ڈیوڈ معاہدے کے تحت انوار السادات نے اسرائیل کے وجود کو تسلیم کر لیا تو یہ ایسا وقت تھا کہ نہ کسی قلم سے مخالفانہ صریر بلند ہوتی تھی اور نہ کسی زبان پہ کوئی حرف تنقید و بیزاری آتا تھا۔ اس سناٹے میں عمر تلمسانی واحد شخص تھے جنہوں نے مخالفانہ بیان دیا۔

پاکستان سے ان کو بہت محبت تھی تحریک اسلامی کو تو وہ سارے عالم اسلام کی ایک مشترک دولت سمجھتے تھے۔ ۱۹۸۲ء میں وہ اسلامی جمعیت طلبہ کی سالانہ کانفرنس میں شرکت کے لیے آئے اور دو ماہ تک پاکستان میں ٹھہرے۔

جیل سے باہر کی ساری زندگی ۲، ۳ کمروں کے سادہ سے فلیٹ میں بسر کی، جس میں نہ فرنیچر ہی کا پورا اہتمام تھا اور نہ دوسرے لوازم کا — گذر بسر تقریباً ۷۰ مصری جنیہ (ساڑھے چار سو روپے پاکستانی کے برابر) پہ رہی۔

اللہ اس ہستیٔ پرنور کی خدمات اور قربانیاں قبول کر کے خصوصی بخشش و رحمت فرمائے۔

اسمٰعیل راجی الفاروقی اور ان کی اہلیہ کا مظلومانہ قتل

بین الاقوامی شہرت یافتہ مسلم مفکر و دانشور ۶۵ سالہ ڈاکٹر اسمٰعیل راجی الفاروقی اور ان کی ۵۹ سالہ اہلیہ لمیس الفاروقی کو نامعلوم قاتلوں نے چھرا مار کر ہلاک کر دیا۔ یہ ۲۷ رمئی کا واقعہ ہے۔

ڈاکٹر الفاروقی فلاڈلفیا کی ٹمپل یونیورسٹی میں مذاہب عالم کے تقابلی مطالعہ کے پروفیسر، امریکہ کی مسلم سوشل سائنٹسٹ ایسوسی ایشن کے بانی، صدر اور انٹرنیشنل آف اسلامک تھاٹ کے بانیوں میں سے تھے۔ مرحوم پاکستان اور پاکستان کے لیے غلبۂ اسلام کے امکانات سے گہری دلچسپی رکھتے تھے — انہوں نے اسلام آباد کی بین الاقوامی یونیورسٹی کے قیام (باقی برصفحہ ۵۶)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اشارات

اُمید اور تشویش کی گھاٹیوں سے گذر کر آنے والا ـــــ مارشل لا کے ۹ سال بعد نمودار ہونے والا پہلا جمہوری بجٹ کیا مقصد رکھتا ہے؟ کس ہدف کی جانب بڑھ رہا ہے؟ کن اُصولوں اور اداروں کو اُبھارتا اور کن کو توڑتا ہے؟ یہ ہیں سوچنے کی باتیں۔ پھر یہ سوال سامنے آتا ہے کہ کن طبقوں اور مالی قوتوں کی ریڑھ کی ہڈیوں کو مضبوط کرتا ہے۔ اور کن عناصر کا خون نچوڑتا ہے یا تھوڑا سا گلوکوز لگا کر زیادہ بہتر انداز سے زیادہ اچھی مقدار میں ان کی شریانوں اور وریدوں سے ایک ایک قطرہ باہر کھینچ نکالتا ہے؟

کیونکہ خون کے ان قطروں کے سکے جب تک جمع نہ ہوں، ایک ایک وزیر پر لاکھوں روپے خرچ نہیں کیے جاسکتے، ایک ایک بہترین ماڈل کی گراں ڈیل کار ہر خادمِ قوم کو فراہم کرکے نہیں دی جاسکتی، بڑے بڑے عہدہ داروں کی تنخواہوں کے کوہ پیکر انبار نہیں لگائے جاسکتے۔ سیاسی منڈی میں اچھی طرح سوداگری نہیں کی جاسکتی۔ بین الاقوامی قرابتوں کی خاطر جام بلائے صحت نہیں ٹکرائے جاسکتے۔

خدا فراموش قسم کی پرستانی ضیافتیں اور آخرت فراموش مرتبے کے جشن ہائے رقص و سرود منعقد کرکے جنسی اودھم نہیں مچائے جاسکتے اور یہ نہیں ہوتا تو رجعت پسندی جان نہیں چھوڑتی بلکہ ساری قوم پر ملائیت کا ٹھپہ لگتا ہے۔ جو لوگ اپنے خرچ پر ننھے شاہ کی گوٹھ (یا زیارت ـــ یا مزار ـــ یا پنڈ) سے ساری عمر آگے نہ جاسکے ہوں انہیں انسانی لہو کی اشرفیوں کے ذریعے سات سمندر پار کی سیاحتیں کرائی جاسکتی ہیں۔ اور یہ نہ کرائی جائیں

تو نہ عقل آتی ہے، نہ علم آتا ہے، نہ تہذیب آتی ہے، نہ ایمان آتا ہے، نہ اخلاق آتا ہے، نہ اصلی اسلام کی سوجھ بوجھ پیدا ہوتی ہے، نہ اجتہاد اور ترقی پسندی میں خمیر اٹھتا ہے اور نہ جسم اور قلب کی بیماریاں دور ہو سکتی ہیں، نہ دنیا ٹھیک، نہ دین درست، یا یوں کہیے کہ نہ خدا خوش نہ شیطان راضی۔ نہ ادھر کے رہے نہ ادھر کے رہے۔

پس نو آبادیاتی علاقے ہوں یا نو آبادیاتی دور سے نکل کر نو آبادیاتی ذہن کے ساتھ ترقی پذیری کے ہوش ربا تجربات کرنے والے ممالک ہوں، ان میں سے کوئی بھی اپنی ڈھیل قوموں سے خون کی دھاریں نکالنے کے اس فنِ لطیف کو نہیں چھوڑ سکتا جس کا منظر خود بہت سے اکابر نے دیکھا ہے بلکہ غاصبوں کی تربیت کے مطابق خود ان کو منگنے کے مٹکے نکال کر سرخ سرخ انسانی امرت رس پیش کیا ہے۔ اب یہ خوئے غلامی تو نہ جائے گی جب تک کہ خون کا آخری قطرہ نہ نچڑ جائے۔

مجھے بجٹ پر اور طرح تبصرہ کرنا ہے، لیکن یہ غلط فہمی نہ ہو کہ میں نے ہندسوں کے کھیل پر اچھی طرح غور نہیں کیا۔ میں پہلے تو یہ دیکھ کر مرعوب ہوا کہ جیسے ایک بڑی بساط بچھی ہے اور اس پر ہندسوں اور رقموں کے بڑے بڑے پیکر تراش کر رکھے گئے ہیں۔ جناب یٰسین وٹو بطور ایک ماہرِ فن یک طرفہ طور پر اس بانئ شطرنج کو کھیل رہے ہیں۔ وہ جس ہندسے کو اشارہ کرتے ہیں اس کا قد کاٹھ بڑھ جاتا ہے جس پر ترچھی نگاہ ڈالتے ہیں وہ جگہ تبدیل کر دیتا ہے۔ اور چاروں طرف گیلریوں میں قوم مجبری پڑی ہے۔ سورج بھی تماشائی، تارے بھی تماشائی۔ عجیب کھیل ہے کہ ایک ہی کھلاڑی ہے اور اسے لازماً فتح بھی ہوتی ہے۔ چت بھی اپنی، پٹ بھی اپنی۔

ایسے کھیل پہلے بھی بہت دیکھے۔

چراغِ راہ کی ادارت (۱۹۴۸ء) سے مجھے اقتصادیات و مالیات کے مطالعے کے ساتھ ساتھ ہر سال مرکزی اور صوبائی بجٹوں اور ٹیکس کی تجاویز کا تجزیہ کرنے میں خاصی دلچسپی

محسوس ہونے لگی۔

اُس زمانے سے آج تک ہر بجٹ (اندر سروے اور ائربک) میں جو بات یکساں طور پر موجود پائی اور جو مسلسل ترقی پا رہی ہے۔ وہ ہماری قومی اقتصادیات و مالیات کے خسارے اور اس کے ساتھ بین الاقوامی قرض کی مقدار ہے۔

اس بجٹ میں بھی سب سے زیادہ جس چیز نے میری توجہ کو اپنی طرف جذب کیا وہ ہماری قومی مالیاتی قوت کا زوال تھا۔ اس خسارے کو دور کرنے کے لیے ایک فارمولا یہ ہو سکتا تھا کہ درآمد زیادہ برآمد کم، پیداوار و دولت زیادہ صرفِ دولت کم۔ درآمد صرف شدید درجے کی ضروریات تک محدود اور آسائش و آرائش اور زیبائش کے اسباب کا ملک میں لانا یکسر ختم۔ بڑے عہدیداروں کی تنخواہیں اور مراعات کم، اندرونِ ملک ضروری اشیاء کی تیاری اس مقصد کو سامنے رکھ کر کہ اوّلاً غذائی اور دفاعی لحاظ سے مکمل خودکفالت اور پھر جملہ ضروریاتِ زندگی کے لحاظ سے بھی۔ تعیشات کا اس قوم کی زندگی میں دخل ہونے ہی نہیں دینا تھا۔ مگر آج تعیشات اور تفریحات ضروریات پر سواری کر رہی ہیں۔ یہ ہماری چالیس سال کی مالیاتی پالیسی کی درماندگیاں اور غلط اقدامیاں ہیں جن کو آج جتنا ہم بھگت رہے ہیں، ہماری اولادیں انہیں اور زیادہ تلخیوں کے ساتھ بھگتیں گی۔

لیکن متذکرہ فارمولے کے بجائے خسارے سے عہدہ برآ ہونے کے لیے ہمارے گزشتہ اور حاضر رہنماؤں نے یہ فارمولا زیادہ پسند کیا کہ دوسروں سے قرض لے لیا جائے۔ آخر قوم کا مزاج تو اوّل روز سے نوابی ہے اور نوابی ہمیشہ بنیے کے سہارے قائم رہتی ہے۔ مختصراً فارمولا یوں ہے — قومی آمد و خرچ اور تجارت درآمد و برآمد میں خسارہ — خسارہ پورا کرنے کے لیے قرض — قرض کی قسط اور سود کی ادائی کی وجہ سے سابق خسارہ میں مزید اضافہ — لہٰذا مزید قرض — اور یہ گھن چکر چلتا جا رہا ہے۔ اور خوب ترقی ہو رہی ہے۔ حسابات جوڑنے کے بعد درآمدی برآمدی تجارت کا خسارہ نصف کھرب روپے تک جا پہنچتا ہے۔ دوسری طرف آج ہمارے سر ۱۰½ بلین ڈالر یا ۱۷۰ بلین روپے کا غیر ملکی قرضہ ہے جس کے متعلق یٰسین وٹو صاحب کے بجٹ کے رو سے قرضوں کی سروسز کے سلسلے میں ادائی کے عنوان سے ۲۹ ارب ۳۴ کروڑ

۸۹ لاکھ روپے ادا کرنا ہیں۔ وزارتِ خزانہ کے ایک پارلیمانی سیکرٹری نے ہاؤس میں ایک سوال کے جواب میں وضاحت کرتے ہیں کہ اصل زر کی قسطوں کی واپسی ۷۶ کروڑ ۷۰ لاکھ ڈالر ہوگی اور سود کی ادائی ۹ ۴ کروڑ ۶۰ لاکھ ڈالر۔ ۵۰ لاکھ ڈالر کا سودی حساب تو صرف امریکہ کو دینا ہے[1] دوسری طرف اس بجٹ کو چلانے کے لیے ۲۶ ارب روپے باہر سے درکار ہیں۔ گویا نئے قرضوں سے تو اس سال کی قسط کی ادائیگی بھی پوری نہ ہو سکے گی۔ کمی قومی پیداواروں اور ٹیکسوں سے پوری کی جائے گی۔

نہ کوئی مارشل لا ایسا ہوا، نہ انتخابی آمر ایسا آیا، نہ جمہوری آمر اور نہ جمہوری ایوان کی وزارت کہ جو قوموں کے اوپر لدی ہوئی ۱۷۰ بلین روپے کی سِل کو ۵، ۱۰ سال میں پوری طرح ہٹا دینے کا منصوبہ سامنے لائی۔ کوئی قیادت اگر قوم میں بیرونی قرضوں کے خلاف جنگ کرنے کا جذبہ پیدا کر کے بچے بچے کو ہم آہنگ کر لے تو وہ تین یا پانچ سال میں بھی نجات پا سکتی ہے۔ پہلا قدم یہ ہے کہ نئے قرضے حاصل کرنے کا سلسلہ یک قلم ختم کر دیا جائے اور پھر ساری قوم

---

[1] لگے ہاتھوں یہ بھی تو جان لیجیے کہ کن کن ساہوکار قوموں کے بہی کھاتوں میں ہمارا شمار ہے اور کہاں کہاں سے ہم نے پاکستان کے لیے "ترقی" قرض پر لی ہے۔ میرے پاس اتفاق سے اس وقت ۳۰ جون ۱۹۸۰ء کی مکمل رپورٹ پڑی ہے، بعد کے کاغذات موجود نہیں۔ اسی سے فہرست قرض خواہاں دیکھ لی جائے۔ امید ہے کہ اس میں اضافہ نہ ہوا ہوگا:

بلجیم، کینیڈا، فرانس، جرمنی، اٹلی، جاپان، نیدرلینڈ، یو کے، یو ایس اے، انٹرنیشنل ڈویلپمنٹ بنک، آئی بی آر ڈی، آئی ایف سی، آئی ایف اے ڈی، آسٹریلیا، آسٹریا، بلغاریہ، چائنا، چیکوسلوواکیہ، ڈنمارک، جرمن (D.K.)، ہنگری، رومانیہ، سنگاپور، سوئٹزرلینڈ، یو ایس ایس آر، ابوظہبی، ایران، کویت، لیبیا، قطر، سعودی عربیہ، اوپیک فنڈ، آئی ڈی بی، آئی ایم ایف ٹرسٹ فنڈ۔ میرا خیال ہے کہ بس اب ناروے، ڈنمارک، برازیل، سری لنکا، یونان، اسرائیل، نیپال وغیرہ جگہیں رہ گئی ہیں۔ ع

ناوک نے تیرے صید نہ چھوڑا زمانے میں

سے کہا جائے کہ تمام عیاشیاں، تمام عاداتِ بد، تمام فضول درآمدات، تمام بڑی تنخواہیں اور اور بھاری عمارتیں اور عالی شان فرنیچر، ختم کر کے حکومت کو اتنے فنڈز فراہم کرو کہ چند سال میں قرضوں کا بوجھ اُتارا جاسکے۔ بچے تک مٹی کے گلّوں میں ایک ایک پیسہ یا ایک ایک آنہ اس مقصد کے لیے جمع کریں کہ اس رقم سے غیر ملکی قرض کو ختم کرنا ہے، بڑی سوسائٹیاں بنا کر کمیٹیاں ڈال ڈال کر اور فضول اخراجات سے پیسے بچا بچا کر سودی قرضوں کے عذاب سے قوم اور اس کے بچوں کو نجات دلانے کے لیے دیوانہ وار زور لگائیں۔ کاش کہ کوئی قوت اُٹھے اور قرضوں سے نجات کی تحریک کا آغاز کرے۔

انتہائی افسوسناک امر ہے کہ خدا کا کوئی ایک بندہ بھی ہماری صفِ قیادت میں ایسا نہ آسکا جو قوموں کو کھا جانے والے اس آسیب سے ہمیں بچانے کے لیے کسی جذبہ بے تاب کا اظہار کرتا ــــ بہ حیثیت مسلمان! بہ حیثیت آزادی پسند! بہ حیثیت قدر شناس جمہوریت! بہ حیثیت انسان! بہ حیثیت کارکن تحریک پاکستان! بہ حیثیت محبِ اقبال! بہ حیثیت دانش ور لیڈر۔ کیا قحط الرجال ہے! ـــ اللہ رے سناٹا، آواز نہیں آتی۔

قرض سے نجات دلانے والی قوت تو کیا اُٹھتی، یہاں تو یہ مقابلہ درپیش رہا کہ کون باہر سے کتنا قرض قوم کو کما کے لا دیتا ہے، کس کے اثر سے بین الاقوامی بنیئے ہماری طرف مراحم خسروانہ کے ساتھ ملتفت ہوتے ہیں۔ معاملہ تو کچھ اس طرح کا رہا ہے۔ جیسے کون سی دلہن جہیز زیادہ لاتی ہے۔ جہیز میں جائیدادیں نہیں آرہیں، بلکہ ایسے عجیب و غریب قرضے آرہے ہیں کہ پہلے منت سماجت کرنی پڑتی ہے، پھر حکومت کے مستحکم رہنے کا یقین دلانا پڑتا ہے۔ اور اسے مستحکم رکھنے کے لیے غیر اخلاقی جوڑ توڑ، سودا بازیوں اور غیر جمہوری جبریت سے کام لیا جاتا ہے۔ پھر مذہبی جنونیوں اور نام نہاد "بنیاد پرستوں" (درحقیقت داعیانِ تجدید و احیائے دین) کو دباتے کچلنے کی اسکیمیں باہمی مشوروں سے بنائی جاتی ہیں، احیائے اسلامیت کی کسی تشویشناک علامت (مثلاً کسی قانونِ شریعت کا نفاذ یا خواتین کا اہتمام پردہ، بلکہ دوپٹہ تک اوڑھنا یا ناچ گانے

پر کوئی پابندی یا فیملی پلاننگ سے گریز وغیرہ) کو اُبھرنے سے روکنے کی ترکیبیں اختیار کرنا، پھر قرض خواہ کو سود بھی دینا، اس کے ماہرینِ فن اور کارکنوں کو بھاری تنخواہوں پر ترقی کی مہمات میں استادانہ مقام ادا کرنے کے لیے بٹھانا، اس کے حسبِ منشا درآمدی برآمدی تجارت کو چلانا اور خام مال دے کر مشینوں وغیرہ کے ساتھ میک اپ کے سامان بہ افراط خریدنا، دُنیا میں نئے تعلقات بناتے وقت اپنے بڑے بنیوں کا خاص لحاظ رکھنا اور اُن کی خاطر ان کی چھپی مگر خبیث ترین قوتوں کے خلاف زبان کو دانتوں میں دبائے رکھنا، بین الاقوامی مجالس میں رائے دیتے ہوئے ان کے اشارہ ہائے ابرو کو سمجھنا —— غرض ہمارے بڑے بڑے قرض خواہ نہ صرف مستعار دولت کا سارا ماحصل لے جاتے ہیں، بلکہ وہ پوری کی پوری دولت واپس لے جانے کے علاوہ ہمارے ہاں سے اور بہت کچھ لے جاتے ہیں۔ درحقیقت وہ ہم سے ہماری آزادی، ہمارا ایمان اور ہماری غیرت چھین لے جاتے ہیں۔

یہ ہے ان قرضوں کی اصل حقیقت جن کے حصول پر خوشی منائی جاتی ہے اور حکومت و قیادت عموماً بغلیں بجایا کرتی ہے۔

دوسرا بڑا مسئلہ اس بجٹ کا یہ ہے کہ اس بجٹ کی بیل کے سارے اچھے اچھے محصول توڑ کر وزارت اور بیوروکریسی کے اعلیٰ دماغوں نے ہار پرو دیئے ہیں اور وہ ہار اس طبقے کے گلے میں ڈال دیئے ہیں جو قومی زمین پر نسلوں سے ناجائز قبضہ رکھ کر اور ناجائز مقاصد کے لیے وہ خدائی قوت کو استعمال کر کے ہزارہا انسانوں —— عورتوں اور بچوں تک کو بھی —— ظلم و جبریت کے چابک سے مار مار کر اپنی غلامی میں استعمال کر رہا ہے۔ یہ وہ طبقہ ہے جس کی سرپرستی میں بڑے پیمانے کے جرائم کو تیزی سے نشوونما مل رہی ہے۔ اسی کی دخل اندازیوں سے سیاسی اسٹیج پر کٹھ پتلیاں نمودار ہوتی ہیں — اور وہ جب چاہے کسی کو پاؤں سے پکڑ کر گھسیٹے اور نیچے گرا دے، کیونکہ ووٹ کی منڈی کا آڑھتی وہی ہے۔ یہی طبقہ اہلِ سیاست کو دھڑوں میں بانٹتا، ان میں سازشیں پیدا کرتا، اور ان کو باہم دیگر ٹکراتا ہے۔ بجٹ کا سارا میلہ یہی لوٹ کر لے گیا ہے۔ کیونکہ معاشرے پر یہی یہی طبقہ مسلط ہے، سیاست کی گردن [illegible] شکنجے میں ہے، ملک کے نظام مالیات کا قبلہ

یہی ہے ۔ اسی مرکزی محور کے گرد تمام مفاد پرست، غلامانِ فرنگ، بیوروکریسی کے اساطین، جرائم پیشہ اور تخریب کار قوتیں، اکثریت کے خلاف محاذ آرا اقلیتیں، بیرونی سازشی عناصر اور ہتھے سے اکھڑی ہوئی خواتین کا اچھلتا کودتا سحر زدہ گروپ وغیرہ جمع ہیں ۔ اور یہ متحدہ محاذ اجتماعیت سیاست میں اسلام کی مداخلت کو روکنے کے لیے ہر اہم مقام پہ سنتری بنا کھڑا ہے ۔ ہماری گردنیں اس مخلوط و متحد قوت کے پنجوں میں ہیں، جبکہ آدھی قوم بھارت سے برباد ہو کر یہاں پہنچی تھی وہ یہاں اس فعال اور مسلط قوت کی لونڈی ہے ۔ اس مخلوط قوت پر لادینیت اس طرح سے سایہ افگن ہے کہ یہاں اب اسلام کی طرف بظاہر ایک قدم بھی آگے بڑھانا ممکن نہیں ۔ اس معرکے میں اسرائیل اپنا کام کر رہا ہے، بھارت کی لابی اپنی جگہ سرگرم ہے ۔ قادیانی اپنے زہریلے مقاصد کے لیے راستے بنا رہے ہیں ۔ روس نے اپنی ڈپلومیسی کا ٹیک بڑھایا تو کیا، کھلم کھلا پاکستانی احوال میں دھماکے کر کے تباہی مچا رہا ہے اور امریکا ایکی جگہ جگہ تخریب کار اپنے خونیں ڈرامے میں کردار ادا کرنے کے لیے متحرک ہو گئے ہیں ۔

خداوندانِ اراضی کے گرد جمع ہونے والے اس "اسلام روک محاذ" کے کئی پیکر ہیں ۔ کوئی اسلام کا مذاق اڑا رہا ہو گا، کوئی پارلیمان میں اسلام کی بات کرنے والوں کے ساتھ "تیلی رے تیلی تیرے سر پہ کولہو" کی ذہنیت سے بوچھاڑ کر رہا ہے ۔ کوئی پیغمبر اسلام، بزرگانِ اسلام یا اصطلاحاتِ اسلام کو ضربیں لگا رہا ہے، کوئی عیاشی، فحاشی اور بے پردگی کے ذریعے اپنے کام کو آگے بڑھا رہا ہے، کوئی ٹیلی وژن سے عین جمعہ کے روز بچوں بچیوں کو ناچ گانے کی تعلیم دے رہا ہے ۔ ایں خانہ تمام آفتاب است! جو جہاں ہے، وہاں ہی زمرد یا قوت ہے ۔

یہی وہ پہاڑ جیسی قوت اس ملک میں رکاوٹ ہے کہ جو شریعت بل کو پاس ہونے دیتی ہے اور نہ معاشرے یا ریاست کو اسلامی مقاصد کی طرف بڑھنے دیتی ہے ۔

مجھے سخت صدمہ ہے کہ اسلام کے نام لیواؤں کے دیس میں ملحدانہ، دولت پرستانہ اور غریب کش نظامِ مالیات بار بار کی جیتی ہوئی بازی کو پھر جیت کے لے گیا ہے ۔

آئیے ذرا ان خوش نصیبوں پر ایک نظر ڈال لیجیے جو خداوندانِ اراضی کے لیے اس بجٹ میں

مقدر ہوئی ہیں۔

بڑے بڑے زرعی گھرانے جو ۱۴ فیصد قومی اراضی پر قابض ہیں، ان کے لیے بجٹ کی بشارات یہ ہیں ۔

۱۔ ۱۴ فیصد بڑی زمینداریوں کی بڑی آمدنیوں کو ٹیکس سے آزاد رکھا گیا ہے جب کہ ۳۰ لاکھ گھرانے ایسے ہیں جن کی سالانہ آمدنی ۴۰۰۰ ۲ روپے سے زیادہ ہے۔

۲۔ پہلے قاعدہ تھا کہ زمیندار اپنی زمین کی درجہ بندی وصلاحیت (یعنی پیداواری یونٹ) کے لحاظ سے اس پر سرکار سے قرضہ لے سکتا تھا۔ مگر اب کرم نامہ یہ کیا گیا ہے کہ کوئی زمیندار اپنی بنجر اور افتادہ اراضی تک پر مارکیٹ ریٹ کے لحاظ سے قرضے لے سکے گا۔ یعنی جن زمینوں کو اس نے لاپروائی کی نذر کر رکھا ہو اور کبھی ان کی آبادکاری کے لیے کوئی محنت نہ کی ہو وہ بھی اب قرضے کا سونا اگلیں گی ۔ پہلے قرضے صرف زرعی اغراض کے لیے ملا کرتے تھے، اب صنعتی مقاصد کے لیے بھی ملیں گے۔ یعنی ایک طرف زمیندار صاحب صنعت کار کے مقابلے پر کھڑے ہوں گے اور مارکیٹ کو متزلزل کر دیں گے اور دوسری طرف نا اہلیت کی وجہ سے کام خراب کریں گے۔ لیکن صنعت کار کو تو اپنے روپے کی فکر ہو گی یا قرض ہو تو اب تک کی روایت کے بموجب وہ واپس کرے گا، مگر یہ نیا مفروض سرمایہ دار ایسا ابھرے گا جو چاہے روپیہ عیاشی اور سرپرستیِ جرائم اور سلسلۂ جنبانیِ سیاست میں کھپا دے، آخر میں آفاتِ ارضی وسماوی کے حوالے سے دس پانچ سال میں درخواست دے گا کہ قرضہ معاف کیا جائے اور اہل اراضی کے قرضے ہمیشہ معاف ہوتے رہیں۔

گویا ایک نااہل اور غلط کار قوت کو اس کے اصل میدانِ کار سے ہٹا کر دوسرے مقاصد کے لیے قومی خزانے کے منہ کھول دیئے جائیں گے کہ آئیے سونے کی اس کان سے جو چاہیں لے جائیے ۔۔۔ رہی واپسی سو ہوتی رہے گی۔

ملک کی ایک ظالم و مفسد قوت میں اس طرح قومی دولت لٹانے کا فیصلہ کر لینا معلوم نہیں اسلام اور قوم اور غریبوں کی کونسی خدمت ہے۔ یا زراعت و صنعت پر کون سا کرم خاص ہے۔

۳۔ کیمیاوی کھاد سے سرکاری امداد ہٹانے کے لیے کئی سال سے آئی ایم ایف کی طرف سے سلسلہ جنبانی تھی۔ مگر اس رعایت کو زمینداروں کے لیے برقرار رکھا گیا۔

۴۔ ان سے کپاس اتنے اونچے ریٹ پر خریدی جائے گی کہ اسے برآمد کرنے کے لیے حکومت کو اپنے کندھوں پر ۲ء۲ بلین نقصان کا بار اٹھانا ہوگا۔

۵۔ غلے، باسمتی چاول اور چینی کی قیمتوں میں ۱۰ فیصد اضافہ کیا جائے گا۔

۶۔ مزید کمی یہ کہ ٹیوب ویلوں کے لیے بجلی کے چارجز کی وصولی میں کمی کر دی گئی ہے یعنی فلیٹ ریٹ ۶۰/- روپے فی ہارس پاور چلے گا۔ مثلاً اگر انجن ۱۰ ہارس پاور کا ہے اور دس ہی ایکڑ زمین کے لیے ہے تو ۶۰/- روپے فی ایکڑ خرچ پڑے گا۔

۷۔ دیہی علاقوں میں جو تھوڑے سے بہت ترقیاتی فنڈ رکھے گئے ہیں۔ وہ بھی کسی نہ کسی طرح مقامی "قوتوں" ہی کے زیر اثر آجاتے ہیں۔ اور وہ جن لوگوں کو جس طرح چاہتے ہیں نوازتے ہیں اور جن کو چاہتے ہیں محروم رکھتے ہیں، بلکہ ذلیل کرتے ہیں۔

بڑا اہم پہلو بجٹ کا وہ ہے کہ غریب پروری کا ایک قدرتی موقع پیدا ہوا تھا، اسے ضائع کر دیا گیا۔ یعنی تیل اور چائے وغیرہ کی قیمتوں کے بین الاقوامی منڈی میں گرنے سے ۱۴ ارب روپے یا جملہ آمدنی کے ۴ فیصد کا اضافہ ہوا۔ اب ایک شکل تو یہ تھی کہ یہ چودہ ارب روپے یا ان کا بڑا حصہ سیدھی طرح اٹھا کر عوام کی جھولی میں ڈال دیا جاتا کہ مہنگے ریٹس کے وقت تم نے جو تکلیف اٹھائی ہے، اب سستے نرخوں کے موقع پر اس کی تلافی کی جا رہی ہے۔ مگر ایسا نہیں ہوا۔

ملا کیا؟ پٹرول میں ۲ء۸ ٪ کمی۔ کیروسین تیل میں ۹ ٪ (غریبوں کے لیے تو بس یہی ایک اصل عطا ہے)۔ فرنیس آئیل ۴ ٪ کمی۔ باقی مراعات خوشحال طبقوں کے لیے ہیں۔ مثلاً موٹر سائیکل اور پارٹس اور سپارکس پلگ پر ۵۰ ٪ کمی۔ کیمرا، کیمرا فلم، پروجیکٹرز پر ۲۳ ٪ کمی۔ سوٹ کیسوں اور بریف کیسوں کے صنعتی اجزا پر ۱۵ ٪ کمی۔ وی سی آر اور فلیبورڈ ملاک پر کسٹم ڈیوٹی، ایکسائز ڈیوٹی

اور سیلز ڈیوٹی میں کمی ۔ رجسٹرڈ فرمز کے لیے کم خاص یعنی انکم ٹیکس میں ۶۰ ٪ سے ۴۲ ٪ کی کمی ۔ ان مفادات کا کم ہی کوئی اثر عام صارفین تک پہنچ سکتا ہے ۔ چائے میں کوئی رعایت نہیں دی گئی ۔

سیمنٹ، گھی، سوتی کپڑے، کیمیاوی کھاد کی پیداوار کم ہو چکی ہے ۔

لیکن متذکرہ عنایات کے عوض قوم سے جو کچھ مزید لیا گیا ہے وہ یہ ہے: لوکل ٹیلیفون کال ۱۵ پیسے اضافہ، لوکل پوسٹیج ۳۳ ٪ اضافہ ــــ ٹیلی وژن کی ایکسائز ڈیوٹی پر اضافہ ۱۰ ٪ ۔ کاسمیٹکس پر اضافہ ۳۰ ٪ ۔ چھوٹے ہوٹلوں اور ٹی اسٹالوں کی ڈیوٹی میں اضافہ تیز سیگریٹوں کی ایکسائز ڈیوٹی میں اضافہ ۔

ترقیاتی مد میں ۴۷ء۴ ارب روپے (۵ء۴۳ وفاقی) رکھے گئے ہیں (پچھلے سال سے ۳۳ ٪ زائد)

کام جو سامنے ہیں:

توانائی کے لیے ۴ برس میں ۱۰۵ ارب روپے درکار ہیں (اس سال ۱۱ ارب)

۸ لاکھ ایکڑ اراضی کو سیم تھور سے محفوظ رکھنے کے لیے ۲۶ء۲ ارب روپے

۳۹۰۰ دیہات میں بجلی پہنچانے، ۳ ہزار کلومیٹر دیہی سڑکیں تعمیر کرنے، ۳۵ لاکھ انسانوں کو پینے کا پانی فراہم کرنے، ۸ لاکھ افراد کو نکاسی آب کا انتظام کر کے دینے کے لیے

تعلیم اور صحت کی سہولتوں میں اضافہ (۱۳ء۴ ارب ہے)، کچی آبادیوں کی اصلاح اور ۷ مرلہ اسکیم کے تحت ایک لاکھ رہائشی پلاٹ (ایک ارب روپے)

ملازمین کے ایک مختصر طبقے کی تنخواہوں اور پنشنوں میں اقتصادی حالات کا تناسب ملحوظ رکھے بغیر صحیح ضرورت سے کم اضافہ ۔ مگر دوسری طرف افراط زر کا سرکاری الفاظ میں ۵ ٪ اور غیر سرکاری ماہرین کے اندازوں کے مطابق ۱۰ ٪ ہونا ۔ اسی طرح ترقیاتی اخراجات کے بالمقابل سرکاری حساب سے غیر ترقیاتی مصارف کا تناسب کل بجٹ کا ۱۰ ٪ ہے ۔ بخلاف اس کے پروفیسر خورشید احمد صاحب آئی ۔ پی ۔ ایس کے گروپ کی تحقیقات یہ ہے کہ تناسب ۱۴ء۷ ٪ ہے ۔

ذرا یہ بھی خیال فرمایئے گا کہ ہماری اسلامی حکومت کے صرف وفاقی حساب میں سال ۸۵/۸۶ء کے سود کے جملہ محاصل ۱۱۹۴۱ر۵ ملین روپے تھے۔ اندیشہ یہی ہے کہ سال پورا ہونے پر یہ ۱۴۴۶۲۲ ملین تک پہنچ جائیں گے۔ گویا سود کا زہر ہماری حکومت اور ہمارے پورے معاشرے اور کاروبار اور رفاقی زندگیوں کے بھی ریشے ریشے تک اتر گیا ہے۔ اس کا خاتمہ تو کجا اس میں کمی بھی نہیں آئی، بلکہ الٹا حکومت نئی بانڈز اسکیم کا اجرا اس لیے کر رہی ہے، کہ پیسے والوں کو سود کی چاٹ اسی طرح لگائی جا چکی ہے جیسے کسی ہپی کو ہیروئن کی ہوتی ہے یہ بھی شاید اسلام کی طرف پیش قدمی کی کوئی صورت ہو گی کہ ہر قدم سود کے سکّے کے اوپر ٹکا کے آگے بڑھا جائے۔

یہ عمومی سی جھلکیاں تھیں۔ اب آیئے ایک اہم معاملے پر۔ رلیبین ڈٹو صاحب نے نہ جانے کتنے بھلے مانسوں کے دل یہ کہہ کر خوش کر دیئے ہوں گے کہ تعلیم پر ہم اس مرتبہ قومی آمدنی ۲٫۲ اور اور کل بجٹ کا ۹٪ (سابق ۵٪) خرچ کر رہے ہیں۔ مزید وضاحت یہ کہ پہلے خرچ ۱۲۸۵ ملین روپے تھا۔ اب کی بار ۲ر۴۴۴۱ ملین روپے ہو گا۔

ہندسوں کے بڑھتے ہوئے اس قامت پر کتنی بھی خوشی منائی جائے، چند سوال سامنے آتے ہیں۔ مسئلہ یہی نہیں کہ تعلیم پر کتنا خرچ کیا جا رہا ہے اور جو خرچ کیا جا رہا ہے وہ حالیہ اضافہ ہونے کے بعد بھی کتنا کم ہے۔ زیادہ بڑا مسئلہ یہ ہے کہ کیسی تعلیم دی جا رہی ہے۔ کیا آپ کی درس گاہیں ـــــ ان کے نصاب، اساتذہ اور وسائل ـــــ اس قابل ہو گئے ہیں کہ وہ اپنے اندر سے خدا کے دین کے سچے علمبردار اور نبیٔ برحق کے عطا کردہ مشن کے نقیب بن کے کھڑے ہو سکیں؟ ایسا ہے تو اس نوع کے طلبہ کا تناسب کیا ہے! کیا آپ کے مخالفِ اسلام نظریات، معاندِ اسلام اساتذہ اور تعلیمی نظام میں پائے جانے والے تضادات کو دور کرنے کا انتظام اور درس گاہ اور معاشرے اور خصوصاً نظامِ تعلیم اور ذرائع ابلاغ یا نظامِ تعلیم اور معیشت کے ٹکراؤ کے روکنے کا آپ نے کوئی منصوبہ اختیار

کیا ہے۔ آخر موجودہ بے مقصد اور بے معیار نظامِ تعلیم کیسے چلے گا؟ اسے جس طرح ملغوبہ یا معجون مرکب بنا دیا گیا ہے اور خوب اچھی طرح اُٹھا کر اسلام پر احسان رکھ دیا گیا ہے اس سے قوم تو تعمیر نہیں ہو سکتی۔ آپ کے معاشرے میں تو پڑھے لکھے غنڈوں اور تخریب کاروں کا اضافہ ہو رہا ہے۔ اور یونیورسٹیاں اسلحہ خانوں اور چھاؤنیوں میں بدل چکی ہیں۔ ایک شے محبتِ پاکستان بھی تھی، مگر علاقہ پرستوں اور نسل پرستوں اور لسان پرستوں نے اس کے چیتھڑے اُڑا دیئے ہیں۔ استاد اور طالب علم کا مقدس رشتہ ٹوٹ چکا ہے۔ تعلیم تدیم انداز پر ایمان و اخلاق دینے ہی سے عاجز نہیں ہے، معقولیت بردباری اور انسان دوستی دینے سے بھی عاجز ہے۔

بس آپ اوپر سے اس میں مخصوڑا بہت روپیہ ڈالتے رہیے۔

کیا یٰسین وٹو صاحب اور ان کے ہم دوش وزراء اور ان کی مقدس حکومت بتا سکے گی کہ تعلیم کے جو دو دھارے یہاں بہہ رہے ہیں ــــ ایک آقاؤں کی تعلیم کا نظم اور دوسرا عوام کی اولاد کے لیے کلرک یا ٹائپسٹ اور ملوں کے مزدور بننے کا نظم، یہ دو عملی آخر کب تک جاری رہے گی۔ لوگ عرصہ دراز سے چیخ رہے ہیں، ماہرینِ تعلیم، تعلیم کے اس برہمنی اور شودری سسٹم کے خلاف برسوں سے آواز اٹھا رہے ہیں۔ اخبارات میں کتنے ہی مدیروں، ایڈیٹروں اور دانشور مضمون نگاروں نے اس لعنت سے ملک کو پاک کرنے کے لیے اپیل کی، مگر جس حکومت کے کانوں پر جوں تک نہ رینگی ہو، بلکہ شاید کان ہوں ہی نہیں، وہ اگر اس سال ۵۹ ارب روپے زاید دے کر ہمارے ذہنوں پر غنودگی طاری کرنا چاہتی ہو تو وہ کامیاب نہیں ہو سکتی۔ وہ برہمنی، شودری سسٹم ختم کر دے تو چاہے ۵۹ ارب روپے واپس لے لے ہم بہت خوشی محسوس کریں گے۔

یٰسین وٹو صاحب وزیرِ تعلیم سے پوچھ کر بتائیں کہ آخر ہماری زندہ و توانا قومی زبان کے ہوتے ہوئے انگریزی زبان ہمارے قصرِ تعلیم میں کیوں سنگھاسن جمائے براجمان ہے اور قومی زبان کو ذریعۂ تعلیم کی حیثیت سے اندر قدم رکھنے کی اجازت نہیں۔ اس سلسلے میں کیا پیش رفت کس رفتار سے ہوئی ہے۔ اور بجٹ کے ساتھ اس کے لیے کیا اسکیم بنائی گئی ہے۔

پھر ہمیں یہ بھی معلوم کرنا ہے کہ سالہا سال کی ایک قومی پکار کو نظرانداز کر کے مخلوط تعلیم کا جو اخلاقی کینسر ہمارے ہاں ٹھونس رکھا گیا ہے، آخر اس میں تبدیلی کیوں نہیں آتی ۔ کیا نئے بجٹ میں کوئی گنجائش رکھی گئی ہے کہ کراچی، لاہور اور اسلام آباد میں خواتین یونیورسٹیاں کھلیں اور تمام زنانہ کالج ان سے مربوط ہو جائیں ۔ ؟ اور اگر نہیں تو کونسی قوت ہے وہ جو خدا اور رسولؐ کی دی ہوئی ہدایت بہ سلسلہ صنفین کے راستے میں مزاحم ہے ؟ کوئی فرد ہے تو ہم اس فرد کو جاننا چاہتے ہیں، کوئی سیاسی جماعت ہے تو ہم اس جماعت کو جاننا چاہتے ہیں، کوئی قیادت و وزارت ہے تو ہم اس قیادت و وزارت کو جاننا چاہتے ہیں۔ کونسا محکمہ رکاوٹ ہے ؟ کونسا ادارہ حائل ہے ؟

پھر ہمیں یہ بتایا جاتے کہ آپ نے قوم کی تعلیم عام کے لیے قومی ذرائع ابلاغ کی مدد سے بصرفِ زرِکثیر یہ جو پروپیگنڈا فیملی پلاننگ کے لیے شروع کر رکھا ہے اور جس کا سلوگن ہے کہ بچے دو ہی اچھے، اور اب اس تعلیم کو آپ ایک طرف ڈاکٹروں کے ساتھ ساتھ حکیموں کے ذریعے اور دوسری طرف اسکولوں میں رائج کرنا چاہتے ہیں، اس کو جو قوم بہ حیثیت مجموعی نہ مانتی ہو اور اسے خلافِ دین سمجھتی ہے، اس پہ زبردستی کیوں ٹھونستے ہیں۔ آپ اس گندی اسکیم کو واپس لے لیجیے اور اس کے ساتھ ۱۵۹ ملین روپے تعلیم والے بھی لے لیجیے اور ۴۷ ملین ترقیاتی مصارف سے بھی معاف فرمائیے۔ خدا را ہمیں ایک ایسے بدترین گناہ میں نہ ڈالیے جس کی وجہ سے اکثریتیں اقلیتوں میں بدل جاتی ہیں۔ اور آپ کے اندر کی اقلیتیں بڑھ کر آپ کا تناسب کم کر دیں گی۔ براہ کرم نظامِ تعلیم کو اس سے پاک رکھیے، ورنہ نوجوان نسل کے لڑکے اور لڑکیوں کو غلط موقع پر غلط انداز سے غلط معلومات دے کر انہیں بدکاری میں مبتلا کر دیں گے اور پہلے کئی قوموں میں ایسا ہو چکا ہے۔

آخری بات تعلیم کے سلسلے میں یہ دریافت طلب ہے کہ آخر آپ نے تعلیم بالغاں کے لیے اب تک کیا کیا اور آئندہ کیا کریں گے۔ یہ بجٹ تو کوئی امید نہیں دلاتا۔ کیا آپ اس ملک کے سو فی صد افراد کو آئندہ ۵ یا ۱۰ برس میں خواندہ بنا دیں گے ؟ آخر ۳۹ سال کا حساب کیا ہے ؟ رفتار کیا تھی ؟ اور آئندہ کتنا وقت لگے گا ؟ اس کام کے لیے مشینری ہے ؟ فنڈز ہیں ؟ ۔۔۔

اگر جواب نفی میں ہو تو معاشرے کی اکثریت کو تعلیم سے محروم رکھ کر اقلیت کو تعلیم دیتے چلے جانا کبھی بھی صحت مندانہ نتائج نہیں دے سکتا۔

تعلیم کے سلسلے میں یہ بھی فرمائیے کہ آپ نے یونینوں کو خلاف قانون قرار دے کر تعلیم گاہوں میں امن قائم کر لیا ہے؟ کیا اس فیصلے کے بعد جو حوادث رونما ہوئے ہیں اور اب جو بارود اندر ہی اندر دبا پڑا ہے اور کسی مرحلے پر پھٹنے کا انتظار کر رہا ہے۔ اس کا کوئی حل آپ نے سوچا ہے۔ کیا یونینوں پر پابندی عاید کرنے سے ان خطرناک امکانات کے اضافے کو آپ روک سکتے ہیں۔ صاف تسلیم کیجیے کہ آپ نے جس مرض کا جو علاج سوچا تھا، تشخیص بھی غلط اور نسخہ بھی غلط۔ اب نئے سرے سے سوچیے۔

درس گاہوں میں جب تک ایسی قوتیں تھیں جو دینی اور اخلاقی اصولوں پر یقین اور اچھے مقاصد کے لیے نوجوانوں کو جمع کر کے انھیں قرآن کے درسوں، سیرت کے جلسوں، تربیت گاہوں، مجالس مطالعہ اور خدمتی سرگرمیوں میں لگائے رکھتی تھیں۔ طلبہ کی اچھی خاصی تعداد مثبت تعمیری انداز کی طرف پیش قدمی کرتی تھی۔ اور اسلام پر اعتقاد کے ساتھ پاکستان کے لیے سچی محبت رکھنے کی وجہ سے اچھی خدمات پیش کرتی تھیں۔ ان کو میدان سے ہٹانے کے لیے کچھ شریر عناصر نے یہ تدبیر کی کہ پروپیگنڈے کے دائرے میں تو اچھے برے سب قسم کے لوگوں کو جماعتوں کے سیاسی آلہ ہائے کار کہہ کر پایۂ اعتبار سے گرایا اور عملاً شرافت پسند اور علم دار ان دین پر مسلح حملے کر کے یہ فضا پیدا کر دی کہ ان نوجوانوں کی تنظیموں کو اگر اسی طرح کام کرنے دیا گیا تو مار دھاڑ ہوتی رہے گی۔ سو تنظیمیں ختم کر دی گئیں اور مار دھاڑ ہوتی چلی جارہی ہے بلکہ پہلے سے زیادہ سنگین شکلیں اختیار کر رہی ہے۔ اب بات عام پستولوں سے آگے نکل کر کلاشنکوف رائفلوں تک پہنچ گئی ہے۔ اصل مصیبت یہ ہے کہ نہ آپ لوگ کالجوں اور یونیورسٹیوں میں غیر طالب علم لوگوں کی آمد اور ان کے قیام کو روک سکتے ہیں، نہ پوری طرح تلاشی لے سکتے ہیں، نہ صحیح مجرموں کے ساتھ صحیح طرزِ عمل اختیار کر سکتے ہیں۔ جرم کی طاقت کو جب اپنے سامنے صرف "کمزوری" ہی "کمزوری" دکھائی دیتی ہے تو وہ مسلسل زور پکڑتی جاتی ہے۔

پس اب سچویشن کو سامنے رکھ کر سوال یہ ہے کہ آیا آپ تعلیم گاہوں کو بارود خانے اور

مراکز جرائم بننے سے روک سکتے ہیں۔ اس کی کوئی اسکیم، کوئی منصوبہ؟ کوئی فنڈ؟ اس بجٹ میں تو ایسی کوئی چیز نہیں۔

ابھی اس بجٹ کے متعلق مجھے بہت دردناک باتیں کہنی ہیں۔

پہلے ذرا یہ حقیقت آجاگر ہو جائے کہ وزیراعظم کے جن پانچ اصولوں کی دھوم ہے کہ سارا بجٹ کیا، پوری قومی پالیسیاں اُن کے محور پر گھومیں گی۔ میں ان اصولوں کے اچھے اچھے کلمات یہاں عرض کرتا ہوں۔

منصفانہ بنیادوں پر مبنی اقتصادی نظام ــــ بے روزگاری دُور ــــ عوامی خوش حالی کا یقینی حصول ــــ ناخواندگی کا خاتمہ ــــ قوم کو جدید سائنسی دَور کے لیے تیار کرنا ــــ رشوت، ناانصافی اور دیگر بدعنوانیاں ختم ــــ عوام کے لیے احساسِ تحفظ وانصاف ــ مضبوط قومی دفاع ــــ غیر جانب دارانہ متوازن خارجہ پالیسی ــــ ملکی وقار اور سالمیت کا استحکام۔

میں ان خوبصورت اور پرشکوہ الفاظ کی داد دیتا ہوں۔ ادیب اور شاعر اور افسانہ گر ایسے ایسے خواب آفریں خوبصورت کلمات کی تلاش میں بڑی کاوشیں کرتے ہیں۔

اصل مسئلہ یہ ہے کہ ۵ نکات کے مطابق جائزہ احوال کیا ہے؟ منصوبہ کیا ہے؟ کونسا کام کب کتنا ہونا ہے؟ بجٹ کا کونسا صفحہ کس نکتے کی تعبیر ہے۔ کم سے کم مجھے تو ان سوالوں کے جواب میں سوائے اُلجھنے کے اور کوئی تجربہ پیش نہیں آیا۔

دلچسپ یہ کہ ان پانچ نکات سے وہ بیچارا مسکین اسلام بالکل خارج ہے جسے ۴۷ء کے بعد سے اب تک کے لوگوں نے بہ طور خانہ زاد بدیں شرط رکھنا چاہا ہے کہ آپ ہمارے جلسے جلوسوں میں شاہانہ پوشاک پہن کر سنہری پیٹی لگا کر آجایا کریں۔ ہم آپ کو خوب سلامیاں دیں گے، پھر فارغ ہوتے ہی ایوانِ خاص کے شاگرد پیشہ کے پچھواڑے میں جو کباڑ خانے والی کوٹھڑی ہے اُس میں چودہ سو سال پُرانا گُدڑ لے کر اس طرح پڑے رہا کریں کہ کھانسی وانسی تک سے یہ پتہ نہ چلے کہ آپ ہیں۔ نیا دگلہ نہیں ملنے کا، کیونکہ یہ اسلامی ریاست ہے اور اس میں اسراف سخت

ممنوع ہے اور آپ ہی کے حکم سے۔

مگر وزیراعظم نے اپنے پانچ نکات والی تقریر میں تبرکاً و تفاؤلاً آغاز قائداعظمؒ کی سبی دربار والی تقریر (۱۹۴۸ء) کے حوالے سے کیا۔

"میرا ایمان ہے کہ ہماری نجات ان سنہری اصولوں پر عمل کرنے میں ہے جو ہمارے عظیم قانون دہندہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمارے لیے مقرر فرمائے ہیں۔ آیئے اپنے ملک میں جمہوریت کی بنیاد صحیح اسلامی تصورات اور اصولوں پر رکھیں۔ ہمارے رب نے ہمیں یہی سبق دیا ہے کہ مملکت کے معاملات میں فیصلے باہمی بحث مباحثے اور مشاورت کی روشنی میں کرنے چاہئیں۔"

اچھا خاصا ایمان تازہ کر دینے والا کلام ہے۔ وزیراعظم کی نشان دہی اور قائداعظم کے ارشادات کی محبت میں میں "نجات کے سنہری اصولوں" عظیم قانون دہندہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم" کی قانونی رہنمائی، "جمہوریت کے صحیح اسلامی تصورات و اصول" جیسے جگمگاتے فانوسوں کی تلاش میں بجٹ کے جنگل میں ادھر سے ادھر تک گھومتا پھرا۔ ہندسوں کی چٹانوں سے چوٹیں کھائیں۔ بڑی بڑی رقموں کی سنگلاخ وادیوں کو پار کیا۔ وزیرخزانہ کے دلچسپ تصورات کے خوابوں میں پرواز کرتا ہوا ایسی ایسی تاریکیوں میں پہنچا کہ جہاں تند گردوباد کی وجہ سے سانس لینا دشوار ہو گیا، مگر مجھے اسلام کا کہیں کوئی نقش پا بھی نظر سے نہ گذرا کہ ادھر سے سواری گذری ہوگی۔ آپ کو معلوم ہے ہی کہ سالانہ مالیاتی سروے میں سے تو اسلام کا موضوع ہی یاروں نے اڑا دیا ـــــ نہ رہے بانس، نہ بجے بانسری۔ (تا بہ بجٹ چہ رسد!)

مجھے دکھاؤ کہ بجٹ میں اسلامی تجلیات کہاں کہاں ہیں۔ اور پھر میں دکھاؤں گا کہ کہاں کہاں اسلام کے چہرے پر زخم لگائے گئے ہیں۔

آخر اس بجٹ میں وہ کون سی چیز ہے جو یہ گواہی دے کہ یہ بجٹ ایک عام قسم کے گروہ انسانی کا نہیں۔ بلکہ ایک عظیم مشن کی علمبردار ملت کا بجٹ ہے جو ہر قسم کی ذہنی غلامی سے آزاد ہے اور جس نے دوسروں کے عنوانات، دوسروں کی اصطلاحات اور دوسروں کے میزانیوں کے روایتی ڈھانچوں کو توڑ کر لوحِ وقت پر نئی تقدیر لکھی ہے؟ جس نے نوآبادیاتی دور، اور پھر آزادی پر پڑنے والے نوآبادیاتی آسیبی اثرات کی زنجیروں کی ہر کڑی کو توڑ ڈالا ہے۔ میں نے ہزار چاہا کہ ہندسوں کے اس شہر سے تحریک پاکستان کی کوئی آواز سنوں، مگر ایسی کوئی آواز خود بجٹ کے اندر سے نہیں آتی۔ باہر سے بجٹ کے سرپرست کیسی ہی شاندار تسبیحیں پڑھتے رہیں۔ میں قوم کے اس گروہ کو جانتا ہوں جس نے پہلے بھی پاکستان اور قائداعظم اور علامہ اقبال کی محبتوں اور عقیدتوں کی تسبیحیں پڑھتے پڑھتے قوم کو اپنے مفاد کی چکی میں پیسا ہے۔ جس نے جماعتیں بدل بدل کر اور حکومت کے نئے نئے نظاموں کے پیرائے میں راستے بنا بنا کر اپنا بھاری جوا کمزور عوام کے کندھوں پر رکھا اور پھر تشدد کے چابک سے اسے چلایا ہے۔ اس ملک کی بدقسمتی ہے کہ قیادت کی مارکیٹ میں جو سکہ ایک بار کھوٹا ثابت ہو جاتا ہے، وہی چند سال بعد پہلے سے زیادہ قیمت پر چلن پاتا ہے۔

کسی کو یاد نہیں کہ وہ کیا کیا باتیں ہیں جو پہلے قائداعظم نے اور پھر ہزاروں پیروکاروں نے زبانی اور تحریری طور پر اس قوم کو مخاطب کر کے کہیں؟ جداگانہ قوم ہونے اور ایک الگ تہذیب کی تعمیر کے لیے کیا کیا استدلال ہم نے پوری دنیا کو مخاطب کر کے کئے؟ کیا کیا باتیں ہم نے ہندو قیادت اور بھارتی حکومت سے سرکاری فیصلوں، جماعتوں کی قراردادوں اور اخباری اداریوں اور دیگر کتب و مضامین میں کہیں؟ سرمایہ داری کے خلاف لٹریچر کا کتنا انبار ہمارے ملک میں پیدا ہوا؟ اشتراکیت کے نظریاتی بطلان اور اس کی تاریخی گمراہیوں پر کتنا وسیع کام ہوا۔ سیکولرازم، میٹریلزم پر کتنی بحثیں نشوونما پاتی رہیں؟ اسلامی نظامِ اقتصادیات و مالیات

کی امتیازی نوعیت پر کتنے ہی مقالے وجود میں آئے ؟

کیا ہمارا موجودہ موجودہ بجٹ ہمارے متذکرہ سارے کام کی تردید نہیں کرتا ؟ کیا ہم اپنے آپ کو اس حیثیت سے پیش نہیں کر رہے کہ ہم اپنے سابق دعووں اور تحقیقاتوں اور اعتقادات و نظریات میں جھوٹے تھے ؟

آپ یہ کہہ سکتے ہیں کہ تمہارا یہ نقطۂ نظر قطعاً غلط ہے۔ ہو گا غلط۔ مگر مجھے صرف یہ بتلایئے کہ اسلام نے ایک اصول مساوات کا دیا تھا۔ اس مساوات کے اصول کی کیا کیا برکات آپ کے بجٹ میں موجود ہیں ؟ کیا اس اصول کے ہوتے ہی جائز ہو گا کہ ایک عہدہ دار کو چار لاکھ روپے تنخواہ دی جائے ؟ کیا آپ نے تمام درآمدی اشیاء پر غور کیا ہے کہ ان میں سے کتنی زیادہ تعداد اسرافیات کی ہے ؟ تمام ملک میں دولت پرستی پھیل گئی ہے۔ دولت معیارِ شرف بن گئی ہے۔ دولت کے ذریعے سیاست کی باگیں ہاتھ میں رکھی جاتی ہیں، دولت کے ذریعے جرائم کا نظام چلتا ہے۔ کیا اس صورت حالات کی درستی کے لیے بجٹ میں کوئی اہتمام ہے ؟

اسلام نے گردنیں چھڑانے کا ایک اصول دیا تھا۔ آپ نے کتنی گردنیں غربت سے، جہالت سے، بیماری سے چھڑائیں ؟ کتنی گردنیں غنڈہ گردی اور چھاپہ ماری سے اور راستوں کی لوٹ مار کے خوف سے چھڑائیں ؟ کتنی گردنیں آپ نے جاگیرداروں، وڈیروں اور بڑے صنعت کاروں کے تصرف میں آئے ہوئے کسانوں اور مزدوروں کی اس ذلت و غلامی و محرومی کی زندگی سے چھڑائیں جس میں وہ نسلاً بعد نسلٍ مبتلا چلے آ رہے ہیں ؟ ہزارہا لوگ ہیں جن کی ہڈیاں بعض خاندانوں سے مدت ہائے دراز سے چچوڑ رہے ہیں، کیا ان کی گردنوں کو آپ نے چھڑانے کی فکر کی ؟

آپ مامور ہیں کہ ظلم کی مختلف اشکال کو ختم کر دیں۔ آپ کے ملک میں لوگ علی الاعلان اغوا ہوتے ہیں، بچے راہ چلتے ہوئے اٹھا لیے جاتے ہیں، عورتوں کو غائب کر دیا جاتا ہے۔

بنک لُٹ جاتے ہیں، گاڑیوں اور بسوں پر ڈاکو چھاپہ مارتے ہیں، نہایت جدید قسم کے خطرناک اسلحہ کی اِدھر سے اُدھر نقل و حرکت ہو رہی ہے اور بسا اوقات کوئی حادثہ یکایک اس خفیہ سرگرمی کا راز فاش کر دیتا ہے۔ پولیس سے مجرم مقابلہ کرتے ہیں اور پولیس والے مارے بھی جاتے ہیں اور پسپا بھی ہوتے ہیں۔ اس سوزِ میں ہر شہری احساسِ تحفظ سے محروم ہو چکا ہے۔ حالانکہ کسی مہذب ملک کی شہریت کی اوّلین برکت ہی یہ ہوتی ہے کہ احساسِ تحفظ حاصل ہو۔ آپ غلط عناصر کی نگرانی کر سکتے ہیں، آپ اہم جگہوں پر نگران مامور کر سکتے ہیں۔ آپ آبادیوں کو منظم کر کے ہر دس گھروں یا سو آدمیوں پر پرانی طرز کا ایک چوکیدار مقرر کر سکتے ہیں۔ آپ گاؤں یا شہری محلوں میں باری باری گھر کی تلاشی لے سکتے ہیں، مگر ستم تو یہ ہے کہ بڑے بڑے حادثات ہو جانے کے بعد آپ ابتدائی سرسری تفتیش بھی کرنے کا کوئی انتظام نہیں کرتے اور نہ نتائج سے آگاہ کرتے ہیں۔ سیالکوٹ کے مولوی اسلم قریشی اور لاہور کے قاری اشرف ہاشمی دو ٹسٹ کیس سامنے پڑے ہیں ــــــ مارشل لا بھی گذرا اور اب جمہوری حکومت کا دور بھی گذر رہا ہے، مگر ان دو اہم شہریوں کے اغوا کے سلسلے میں حکومت نے ہمیں معلومات صفر سے زیادہ مہیا نہیں کیں۔

ملک میں بعض تخریب پسند قوتیں خانہ جنگی کے انتظامات کر رہی ہیں، لوگ انہیں تشویش سے دیکھ رہے ہیں، مگر بجٹ کیا، عام تقریریں بھی نہیں بتائیں کہ کوئی انتظام ہو رہا ہے۔ بعض صوبوں میں علیحدگی کے ویسے ہی ہتھکنڈے اختیار کیے جا رہے ہیں جیسے بنگلہ دیش بنانے والوں نے کیے تھے اور ان کے جواب میں یا غلط تدابیر ہیں یا خاموشی ــــ ایک صوبے کے حالات تو اس حد تک بگڑ چکے ہیں کہ پاکستان کے خلاف، اسلام کے خلاف، پنجاب کے خلاف، اُردو کے خلاف، قومی اکابر کے خلاف، ثقافتی اور معاشرتی قدروں کے خلاف کھلم کھلا جلسے کیے جاتے ہیں اور کسی کے لیے مجال دم زدن نہیں۔ بگاڑ سامنے ہے اور چارہ کار سامنے نہیں۔ آج سے پانچ سال پہلے کام ہو سکتا تھا۔ نہیں ہوا تو اب اس طرح سوچا جائے کہ نظریات کا مقابلہ نظریات سے، دلائل کا دلائل سے، لٹریچر کا لٹریچر سے، شکایات کا شکایات سے اور محرومی حقوق کا ادائے حقوق سے، نفرت کا محبت سے ــــــ اور ایک

آخری حدود سے تخریب کارانہ اور مجرمانہ دائرے میں ـــ قوت کا قوت سے کیا جائے گا (اور اس دائرہ میں کوئی لحاظ اور کوئی رعایت کام نہ کرے گی) تو بگاڑ کے آخری نشان تک پہنچنے سے پہلے حل نکل سکتا ہے۔ سندھی، پنجابی، سرحدی اور بلوچی باہمی کھینچا تانی کے بغیر خدمتِ اسلام اور بہبودِ انسانیت کی راہ پر گامزن ہو سکتے ہیں۔

کیا آپ سے یہ کام بھی نہیں ہو سکتا کہ ایک مجاہد فورس یا جہاد گروپ منظم کریں جس کے تحت آوارہ نوجوانوں کی تربیت ہو، ملک و دین کی محبت اُن کو سکھائی جائے۔ اور اسلام اور پاکستان کی دشمن قوتوں کی شرپسندیوں کے جواب میں ان کو بہ سرِ عمل لایا جائے۔ یہ لوگ ایک طرف اندرونی تخریب کاروں سے معرکہ آرا ہوں اور دوسری طرف بیرونی حملہ آوروں یا سازش کاروں کی شرارتوں سے۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ طبقہ جو اس بجٹ کے پیچھے کام کر رہا ہے اس کے ہر فرد نے اپنے سینے میں قائداعظم اور علامہ اقبال کے مزار بنا رکھے ہیں جن پر اسلامی جذبات کے جھنڈے لہراتے رہتے ہیں۔ اور خوبصورت نعروں اور کلمات کے پنچھی خدا کی تسبیحیں کہتے رہتے ہیں اور یہ تمام حضرات ہر اہم موقع پر پُرنور عقیدتوں کی چادریں اُن پر چڑھاتے اور محبتوں کے فانوس روشن کرتے رہتے ہیں۔ اور پھر اسلام کا سارا حق یُوں ادا کر دینے کے بعد ایسے سنگ دل بن جاتے ہیں کہ قومی سرگرمیوں اور حکومتوں کے پروگراموں اور پالیسیوں میں ذرا سا بھی نور راستہ نہیں دیتے کہ اسلامی اصول و اقدار سر اُبھار سکیں۔ نفاذِ شریعت کا فیصلہ کرنے کا ایوان میں وعدہ کرنے کے بعد یہ کام لٹک رہا ہے اور اسے ہونے نہیں دیا جاتا بلکہ حال یہ ہے کہ اسلام کی آواز اُٹھا سکنے والے ہر آدمی کو لادینیت پسند مسلمان ایسے توہین آمیز طریقے سے دباتے ہیں کہ بات بننے نہ پائے۔ ایک ایک خاتون اس معاملے میں نہ صرف عظیم مجتہدۂ اسلام بن کر بلکہ مجاہدۂ اسلام بن کر رستمانہ انداز سے ٹوٹ پڑتی ہے، اور ادھر اخبارات میں لادینیت پسند مسلمانوں کے حق میں طائفے کے طائفے حرکت

میں آجاتے ہیں۔ یعنی آج ہم اسلام کے خلاف ایک بڑی ہی خوفناک داخلی سازش سے دوچار ہیں۔ جس کا ایک شعبہ یہ ہے کہ دینی گروہوں کو افتراق کا شکار بنا دیا گیا ہے اور دوسری طرف اسلام کے بارے میں تضاد کے ایک جادو سے کام لیا جا رہا ہے۔ یعنی تعریف توصیف کرتے ہوئے زمین و آسمان کے قلابے ملا دیں گے۔ اور کوئی عملی تقاضا سامنے آئے تو فرمائیں گے کہ یہ تو رجعت پسند ملاؤں کی باتیں ہیں۔ ہماری اسلامی ریاست تو جدید طرز کی وسیع الخیال ریاست ہے۔ اس تضاد کے اوّلین استاد مغرب کے اسلام دشمن مستشرقین ہیں۔

وقت قریب آ رہا ہے کہ سازشی اور فریب کارانہ اور پُر تضاد طریقے ہیا گہ غتوراہو جائیں گے۔

راقم کا اگر بس چلتا تو اس بجٹ کو قطعی طور پر مسترد کر دیتا۔ مگر مجبوری ہے کہ صرف صدائے احتجاج ہی بلند کی جا سکتی ہے۔

حکمتِ سیّد مودودیؒ

(ادارہ)

ہماری معاشی پالیسی کے بُنیادی مقاصد یہ ہیں :

——عادلانہ تقسیم دولت۔

——دولت کو چند ہاتھوں میں مرتکز ہونے سے روکنا۔

——ظلم اور ناجائز استحصال کی تمام صورتوں کا خاتمہ۔

——تمام لوگوں کے لیے مساوی مواقع کی فراہمی۔

——معاشی ترقی کے فوائد سے تمام لوگوں کو مستفید ہونے کا موقع دینا۔

——مُلک سے غربت کا خاتمہ اور اس امر کی ضمانت کہ بنیادی زندگی سے کوئی باشندہ محروم نہ رہنے پائے۔

منشور جماعتِ اسلامی ۔ ۱۹۷۰ء
ص — ۲۲

بحث و نظر

بجٹ پر ایک نظر

چوھدری رحمت الٰہی صاحب - نائب امیر جماعت اسلامی پاکستان

مارشل لاء کے خاتمے کے بعد یہ پہلا بجٹ ہے جو سیاسی پس منظر کے حامل وزیر خزانہ نے پیش کیا ہے۔ لیکن یہ عوام کی توقعات پر پورا نہیں اترا - توقع کی جا رہی تھی کہ عوام کو کافی زیادہ مراعات دی جائیں گی - کیونکہ عالمی منڈی میں تیل، خوردنی تیل اور چائے کی قیمتوں میں بہت زیادہ کمی ہونے کی وجہ سے حکومت کو کافی بچت ہوئی ہے۔ حکومت نے اس بچت میں عوام کو شریک کرنے میں بہت بخل سے کام لیا ہے - تیل کی قیمت میں صرف ۲۰ پیسے فی لیٹر کمی کی گئی ہے جو اس وقت سوا سات روپے فی لیٹر فروخت ہو رہا ہے اور ہائی سپیڈ ڈیزل میں چالیس پیسے فی لیٹر کمی کی گئی ہے جب کہ بین الاقوامی منڈی میں تیل کی قیمتیں ایک تہائی رہ گئی ہیں - لوگوں کو جو سہولت دی گئی ہے وہ اس کمی کا عشر عشیر بھی نہیں ہے -

پندرہ سو روپے ماہوار تک تنخواہ پانے والے ملازمین کو ساڑھے چار فیصد اور پندرہ سو روپے سے زائد تنخواہ پانے والوں کو ساڑھے تین فیصد (INDEXATION BENEFIT) دیا جائے گا جب کہ حکومت کے اپنے اعلان کے مطابق افراط زر کی شرح ۵ % سے زیادہ ہے لیکن درحقیقت افراطِ زر کی شرح دس فی صد سے بھی زیادہ ہے - اس طرح تنخواہ دار طبقہ کو اس معمولی اضافہ کے باوجود سخت حالات کا سامنا کرنا پڑے گا -

اسلامی نقطۂ نظر سے بجٹ بہت مایوس کن ہے - بجٹ میں تمام سطحوں پر سود کو قائم

رکھا گیا ہے۔ بانڈز کا آزادانہ استعمال کیا گیا ہے اور بانڈز کی بنیاد پر نئی سکیمیں بلا کراہت تجویز کی گئی ہیں۔ تین سے دس فی صد شرح سود تک اندرونی و بیرونی مشینری کے لیے قرضے دینے کا فیصلہ کیا گیا ہے اور وزیر خزانہ نے معیشت کو اسلامی سانچے میں ڈھالنے کی حکومت کی اعلان شدہ پالیسی سے انحراف کرتے ہوئے کسی معذرت کا اظہار کرنا بھی ضروری نہیں سمجھا۔ وزیر خزانہ نے جی این۔ پی میں تبدیلی کی بنا پر بانڈز پر منافع کی انڈیکیشن کی جو نئی تجویز پیش کی ہے وہ اسلامی لحاظ سے ناقابلِ قبول اور معاشی لحاظ سے ناقابلِ حصول ہے۔

میں حکومت سے دردمندانہ اپیل کرتا ہوں کہ حکومت اپنی پالیسی پر نظرثانی کرے اور دیانت داری سے حرمتِ سود سے متعلق اسلامی احکامات پر بلا حیل وحجت اور بلا چون وچرا عملدرآمد کی کوشش کرے۔

بجٹ تعلیمی شعبے کو مزید ترقی دینے میں ناکام رہا ہے جس کے لیے ایک علیحدہ اقرا ٹیکس کے ذریعے کافی وسائل جمع کیے جا رہے ہیں۔ تعلیم شدید زبوں حالی کا شکار ہے۔ دیہی علاقوں میں صورتِ حال اور بھی خراب ہے۔ معیارِ تعلیم روز بروز گرتا جا رہا ہے۔ حقیقت پسندانہ اور مؤثر پروگرام کی عدم موجودگی کی وجہ سے خواندگی مہم کے نام پر کثیر وسائل ضائع ہو رہے ہیں۔ حکومت کو تعلیم کے نظریاتی پہلو اور معیارِ تعلیم کی بہتری کی طرف بھی لازماً توجہ دینی چاہیے۔

یہ امر بہت افسوسناک ہے کہ بجٹ میں سارا زور مراعات یافتہ طبقے کو مزید ریلیف دینے پر صرف کیا گیا ہے اور عام آدمی پر بوجھ لادا گیا ہے۔ ڈاک اور ٹیلی فون کے نرخوں میں اضافے سے ملک کا ہر شہری متاثر ہوگا اور اس بات کی کوئی ضمانت نہیں ہے کہ پیٹرول اور ڈیزل کی قیمت میں جو برائے نام کمی کی گئی ہے وہ عام صارف تک پہنچ سکے گی۔

وزیر خزانہ نے ۹ کروڑ روپے کی اضافی رقم کا دعویٰ کیا ہے جب کہ حقیقتاً تین سو کروڑ روپے کا خسارہ ہے جس کے بارے میں یہ واضح نہیں کیا گیا کہ یہ خسارہ کہاں سے پورا کیا جائے گا۔ کیا اس خسارے کو پورا کرنے کے لیے حسبِ سابق قوم کو ایک منی بجٹ دیا جائے گا۔ وزیر خزانہ کو اس سوال کا واضح جواب دینا چاہیے۔

اس بجٹ میں بھی بیرونی قرضوں پر پاکستان کے انحصار میں کوئی کمی نہیں ہوئی۔ بیرونی قرضے ہمارے مالیات کا اہم ذریعہ ہیں۔ [illegible] گزشتہ تقریباً ساٹھ فیصد [illegible]

ایک سو ستر بلین روپے ہیں۔ اس سال جو بیرونی قرض لیا جائے گا وہ تمام اس قرض کے سود کی ادائیگی میں چلا جائے گا۔ یہ صورت انتہائی پریشان کن ہے۔

بجٹ اب قومی اسمبلی کے سامنے پیش ہے۔ حکومت اور تمام ارکانِ اسمبلی سے میری خصوصی اپیل ہے کہ وہ بجٹ کا تفصیلی جائزہ لے کر اس میں بنیادی تبدیلیاں کریں تاکہ عام لوگوں کو کچھ بنیادی ریلیف دیا جا سکے اور زراعت پیشہ لوگوں، چھوٹے کاروباری طبقے اور خود کام کرنے والے اہلِ صنعت و حرفت کی حوصلہ افزائی کی جا سکے۔ ان طبقات کی حوصلہ افزائی کر کے ہی ملک اقتصادی خود کفالت حاصل کرنے کی منزل کو پا سکتا ہے۔

وہ اقدامات جو مرکزی بجٹ کے تحت ضروری ہیں

(وزیر اعظم اور وزیر خزانہ سے اپیل)

جناب میاں طفیل محمد صاحب۔ امیر جماعت اسلامی پاکستان

یہ عجیب بات ہے کہ بجٹ جو ہر قوم کی مالی زندگی کا ایک مستقل سالانہ فیچر اور معمول کا واقعہ ہے۔ ہمارے ملک میں یہ ہر سال خوف و ہراس کا پیش خیمہ اور شہریوں کے لیے سراسیمگی کا پیغام بن کر آتا ہے۔ اور ہمارے ہر بجٹ کے بعد اشیائے ضرورت کی قیمتوں میں اور ٹیکسوں کے بوجھ میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ اب پھر چند دنوں کے بعد نیا بجٹ آنے والا ہے اور باشندگانِ ملک اس سے خوف زدہ ہیں۔ اس موقع پر میں ملک کے وزیر خزانہ اور وزیر اعظم سے پوری دردمندی کے ساتھ یہ کہنا چاہتا ہوں کہ بجٹ کی اس خوفناک روایت کو تبدیل کریں۔ نئے جمہوری دور کے ساتھ بجٹ کے سلسلے میں بھی بہتر روایات کا آغاز کریں۔ اس بجٹ کو اسلام کے فلاحی نظام کی طرف پیش قدمی اور عوام کی مشکلات کم کرنے کا ذریعہ بنائیں۔ اس مقصد کے لیے میرے خیال میں درج ذیل اقدامات آسانی سے کیے جا سکتے ہیں۔

ا۔ حکومت اپنے انتظامی اور غیر پیداواری مصارف کا سنجیدگی سے حقیقت پسندانہ جائزہ لے اور اپنے ان تمام شاہانہ اور مسرفانہ اخراجات کو جو محض ظاہری شان و شوکت

اور رعب داب کے لیے کیے جاتے ہیں یکسر ختم کر دے۔ گذشتہ پندرہ سال میں اور خصوصیت سے ۸۰-۱۹۷۹ء سے غیر پیداواری اخراجات میں بے پناہ اضافہ کیا گیا ہے۔ حکومت کفایت شعاری اور سادگی کی باتیں بہت کرتی ہے لیکن زندگی کے ہر شعبہ میں عملاً اسراف اور نمائشی مصارف کی ریل پیل ہے۔ اب ان چیزوں کو بالکل ختم نہیں تو اتنا ضرور کم کر دیا جائے کہ لوگوں کو نظر آئے کہ حکومت سادگی اختیار کر رہی ہے۔

۲ ۔ بین الاقوامی حالات کی تبدیلی سے حکومت پر جو دو بڑے بوجھ تھے اُن میں نمایاں کمی ہو گئی ہے۔ پٹرول کی قیمت ۳۲ اور ۳۵ ڈالر فی بیرل سے گر کر ۱۰ اور ۱۲ ڈالر ہو گئی ہے چنانچہ اس کی درآمد پر جو ۳۔۱ بلین ڈالر کا زرمبادلہ خرچ ہو رہا ہے وہ اب صرف ۷ اور آٹھ سو ملین ڈالر رہ گیا ہے۔ اس طرح خوردنی تیل جس کی قیمت گیارہ سو ڈالر فی ٹن تک پہنچ گئی تھی۔ وہ اب ۲۰۰ اور ۲۵۰ ڈالر فی ٹن مل رہا ہے۔ خوردنی تیل کی قیمتوں میں صرف علامتی کمی ہوئی ہے۔ اور پٹرول اور اس کی مصنوعات میں سرے سے کوئی ریلیف عام شہریوں کو نہیں دیا گیا۔ حالانکہ جب ان چیزوں کی قیمتیں عالمی منڈیوں میں بڑھی تھیں تو یہی کہہ کر فوراً اضافہ کر دیا گیا تھا کہ اس بوجھ کو صارفین ہی کو اٹھانا پڑے گا۔ لیکن اب قیمت کم ہونے پر صارفین کے ساتھ یہ ظلم بدستور روا کیوں رکھا جا رہا ہے؟ پٹرول کی قیمتوں کو گرے ہوئے تقریباً آٹھ ماہ ہو چکے ہیں لیکن اس سلسلہ میں حکومت نے چپ سادھ رکھی ہے۔ ان دونوں معاملات میں زیادتیوں کا اس بجٹ میں لازماً ازالہ ہونا چاہیے۔

۳ ۔ عام شہریوں کی ضرورت کی چیزوں کی قیمتوں میں استحکام پیدا کرنا اور اضافہ کے رجحان کو روکنا حکومت کی ذمہ داری ہے۔ ورنہ روز افزوں مہنگائی ہر شعبۂ زندگی میں عوام کو پریشان کر کے سڑکوں پر لے آئے گی۔

شہری خدمات کے اداروں کا حال نہایت خراب ہے اور روز بروز بدتر ہو رہا ہے۔ مثلاً بجلی کی لوڈ شیڈنگ، ہسپتالوں کی حالتِ زار، اسکولوں کی ناگفتہ بہ حالی، امن و امان، سڑکوں کی شکستہ حالت، یہ چیزیں اس امر کی علامت ہیں کہ مختلف حکومتی اداروں کا ڈھانچہ درہم برہم ہو رہا ہے۔ ایک طرف سروسز کا یہ حال ہے اور دوسری طرف

سروس چارجز کے عنوان سے ان کی قیمتیں برابر بڑھائی جا رہی ہیں اور قیمتیں جتنی بڑھتی جاتی ہیں سہولتوں کی حالت اتنی ہی دگرگوں ہوتی جاتی ہے۔ اس صورت حال پر قابو پاتے کا حکومت کو انتظام کرنا چاہیے۔

۴ ـــ مزدوروں اور کم تنخواہ پانے والے سرکاری اور نیم سرکاری ملازمین کی حالت سخت پریشان کن ہے۔ ان کے معاوضے اتنے کم ہیں کہ ایک کنبے کی کم سے کم بنیادی ضروریات زندگی کسی طرح سے پوری نہیں ہو سکتیں۔ انڈیکسیشن (INDEXATION) کے نام پر جو اسکیم رائج کی گئی تھی وہ ناکام رہی ہے۔ افراطِ زر کی جو شرح حکومت بتا رہی ہے یعنی ۵ یز، وہ حقیقت کے قطعاً خلاف ہے۔ اس کے نتیجے میں تنخواہوں میں اضافہ ۳ اور ۴ فیصدی ہوگا جو مہنگائی سے پیدا ہونے والی مشکلات کے مقابلے کے لیے قطعاً ناکافی ہے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ اجرتوں کے پورے نظام کو از سرِ نو حقیقت پسندانہ بنیادوں پر تشکیل دیا جائے تاکہ ایک عام آدمی کی اجرت ایک طرف اس کی حقیقی ضروریات کو پورا کرنے کی ضامن ہو تو دوسری طرف کارکن کے لیے پیداوار بڑھانے کی محرک بنے۔ اس کے علاوہ ملک میں عام بے روزگاری ہی نہیں، پڑھے لکھے لوگوں کی بے روزگاری بڑھ رہی ہے جو درحقیقت ملک کے نظامِ تعلیم کے بانجھ پن اور دیوالیہ ہونے کا ثبوت ہے۔ اس کی طرف بھی ہمارے حکمرانوں کو توجہ کرنی چاہیے۔

۵ ـــ ہمارے زرعی شعبہ کی حالت بھی ہرگز اطمینان بخش نہیں ہے۔ بلاشبہ بڑے زمینداروں کو کافی بلکہ بڑے فوائد پہنچ رہے ہیں۔ لیکن عام کاشتکار جو زرعی آبادی کا ۸۰ فیصد سے بھی زیادہ حصہ ہے، سخت پریشانیوں سے دوچار ہے۔ زرعی اجناس کی صحیح قیمت اسے نہیں مل رہی۔ زرعی شعبہ کے لیے قرض اور سرمایہ کی فراہمی بہت ناکافی ہے۔ بین الاقوامی اور ملکی قیمتوں کے فرق کا فائدہ نہ کاشتکار کو پہنچ رہا ہے اور نہ ملکی خزانے کو۔ اسے سرکاری کارپوریشنیں اور درمیانی طبقہ ہضم کر رہا ہے۔ مارکیٹنگ کا اچھا نظام نہ ہونے کے باعث بھی کاشتکار محنت کے ثمر سے محروم رہتا ہے اور چند ہزار بڑے زمیندار ہی سرکاری اسکیموں سے جائز و ناجائز فائدہ اٹھا رہے ہیں اور ٹیکس سے بھی

ان کو مکمل چھوٹ ہے۔ مذکورہ ۸۰ فیصدی محروم آبادی کے حقوق کی طرف بھی توجہ کرنی چاہیے۔

۶ — درآمد اور برآمد کا خسارہ آسمان سے باتیں کر رہا ہے۔ برآمدات کو بڑھانے کے لیے جو بھی اقدامات کیے گئے ہیں وہ فرسودہ اور غیر مؤثر ہیں۔ اور درآمدات پر کوئی کنٹرول نہیں ہے۔ بین الاقوامی مالیاتی فنڈ اور قرضہ دینے والی ایجنسیوں کے دباؤ کے تحت درآمدات کو بالکل کھلی چھوٹ دی ہوئی ہے۔ جس کے نتیجے میں اب سالانہ خسارہ ۹۰ بلین روپے تک پہنچ گیا ہے۔ خسارہ کی سرمایہ کاری اور زرمبادلہ میں مسلسل تخفیف قدر (DEVALUATION) معمول بن گیا ہے۔ بیرونی قرضے بڑھ رہے ہیں۔ اور زرمبادلہ کی قدر کے گرنے سے قرضوں کی ادائیگی کی شرح (DEBT - SERVING) مہنگی سے مہنگی تر ہوتی جارہی ہے۔ یہ تمام چیزیں قومی معیشت میں بنیادی بگاڑ کی علامات ہیں، جن کا سنجیدگی سے نوٹس لینے کی ضرورت ہے۔

۷ — انکم ٹیکس کے موجودہ نظام سے ملک اور خصوصیت سے ایماندار تاجر بے حد پریشان ہیں۔ نفع و نقصان میں شراکت کی بنیاد پر کاروبار کی راہ میں بھی موجودہ انکم ٹیکس کا نظام سب سے بڑی رکاوٹ ہے۔ انکم ٹیکس کا عملہ جس طرح تاجر برادری کو لوٹ رہا ہے وہ کوئی ڈھکی چھپی چیز نہیں ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ معیشت کا ایک بڑا حصہ بلیک اکانومی بن چکا ہے اور عام سرمایہ کاری کے لیے رکاوٹ بن رہا ہے۔ پچھلے سال وعدہ کیا گیا تھا کہ چند مہینوں میں ٹیکس ریفارم کمیشن کی تجاویز قوم کے سامنے آجائیں گی۔ لیکن ایک سال گزرنے کے بعد بھی صرف عبوری رپورٹ کی خوشخبریاں سنائی جارہی ہیں۔ قومی خیرخواہی کا تقاضا ہے کہ انکم ٹیکس کے اس ظالمانہ نظام سے ملک کو نجات دلائی جائے اور انصاف پر مبنی متبادل نظام لانے کو اولیت دی جائے۔

۸ — بجٹ اور مالیاتی نظام کے سلسلے میں سب سے زیادہ میں جس امر کی طرف توجہ دلانا چاہتا ہوں، وہ معیشت کو اسلامی سانچے میں ڈھالنے کا مسئلہ ہے۔ بانی پاکستان سے لے کر ملک کے ہر سربراہ نے پاکستان میں اسلامی فلاحی ریاست قائم کرنے کا دعویٰ کیا ہے، لیکن اس

سلسلہ میں کوئی واضح پالیسی آج تک اختیار نہیں کی گئی۔ جو اقدامات پچھلے چند سالوں میں ہوئے ہیں اُن کا جو حشر ہوا ہے وہ سخت افسوسناک ہے۔ زکوٰۃ و عشر کی مد میں متوقع آمدنی کا پانچواں حصہ بھی نہیں آرہا ہے۔ پھر یہ بھی برابر سُننے میں آرہا ہے کہ زکوٰۃ و عشر کو ان مصارف کے لیے استعمال نہیں کیا جارہا جو اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے لیے مقرر کیے ہیں۔ نیز اس مقدس امانت کی تقسیم میں بدعنوانیوں کی شکایات بھی بڑھتی رہی ہیں۔

میں حکومت اور قوم کے خدا کے حضور جواب دہی کا احساس رکھنے والے تمام لوگوں کو اس طرف متوجہ کرنا چاہتا ہوں کہ سُود جسے قرآن مجید نے خدا اور اس کے رسولؐ سے براہ راست جنگ کرنے کے مترادف قرار دیا ہے اس سے مُلک کی معیشت کو پاک کرنے کی فکر کریں۔ اس لعنت کو ختم کرنے کے لیے جو اقدامات اب تک کیے گئے ہیں ان کا حال بہت زبوں اور رُو بہ زوال ہے۔ نفع و نقصان کی بنیاد پر اسلامی اُصول کے مطابق سرمایہ فراہم کرنے کے بجائے مارک اپ اور بائی انگ بیک (BUYING-BACK) کے نام پر سُود کی رُوح ہی کو نہیں اپنی اس کی شکل کو بھی باقی رکھا جارہا ہے۔ مارک اپ کی شرح ماضی کے سُود سے بھی زیادہ ہے اور معلوم ہوا ہے کہ بڑے سرمایہ داروں سے مارک اپ کی شرح اگر ۱۲ اور ۱۴ فیصد تھا ہے تو چھوٹے تاجروں اور صنعت کاروں سے بہ شرح ۱۶ اور ۱۸ فی صدی تک لی جارہی ہے جو صریح ظلم اور اسلام کے نام پر کمزوروں کا استحصال ہے اور اسٹیٹ بنک اور حکومت مسلسل نئے سُودی بانڈ جاری کر رہے ہیں۔ این۔ ڈی۔ ایف۔ سی نے اپنی سرمایہ کاری کے اُصولوں میں کوئی جوہری تبدیلی نہیں کی ہے۔ اسی طرح سے پی۔ ایل۔ ایس کھاتوں کی شکل میں جو جزوی اصلاح شروع ہوئی تھی وہ بھی غتر بود کر دی گئی ہے۔ اسلامی نظریاتی کونسل کی رپورٹوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ کونسل نے کم از کم چند بار اس صریح خلاف ورزی کی نشان دہی کی ہے لیکن حکومت نے اس کی کوئی پروا نہیں کی ہے۔ مُلک کے مختلف گوشوں سے علماء کرام نے اس پر احتجاج کیا ہے اور سینٹ میں اس پر قرارداد بھی آئی ہے، لیکن حکومت کی روش میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی۔

اسلام کے احکام کے ساتھ یہ طرز عمل شریعت کے ساتھ کھلا مذاق ہے۔ یہ صورت حال اس

صدر اور قومی اسمبلی کے تحت پیش آ رہی ہے جن میں سے ہر ہر فرد اسلامی نظام کے قیام اور شریعت کے نفاذ کا عہد کر کے منتخب ہوا ہے۔ اس لیے میں حکومت اور اسمبلی کے تمام ذمہ داروں اور ان کے ہر فرد سے ملک اور قوم کے علاوہ خود اس کی اپنی بھلائی کے لیے اپیل کرتا ہوں کہ وہ ملک کے پورے نظام کو غیر اسلامی اجزا سے اور ہمارے نظام معیشت کو سود سے پاک کرنے کے کام کو اسلامی نظریاتی کونسل کی تجاویز کے مطابق پایۂ تکمیل کو پہنچائے اور پوری قوم کی دنیا اور عاقبت سنوار دے۔ اب تو بنی اسرائیل کی طرح صحرائے سینا میں چالیس سال بھٹکتے پھرنے کی مدت بھی آپ نے پوری کر لی ہے، اللہ اب اور مہلت کب تک دے گا۔ چالیس برس خدا اور اس کے بندوں سے لڑائی میں آدھا ملک تو کھو دیا ہے۔ اب اس کی فرمانبرداری کی راہ اختیار کر کے باقی ماندہ کو بچا لیجیے۔

حسن البنّا کی شخصیت

جناب محمد اسحٰق صاحب

اِس دُنیا میں کچھ لوگ صرف اپنے لیے جیتے ہیں۔ جب وہ مرجاتے ہیں تو کسی کو خبر بھی نہیں ہوتی، لیکن کچھ ایسے بھی ہوتے ہیں کہ جب دُنیا سے کوچ کرتے ہیں تو گو آنکھوں سے اوجھل ہو جاتے ہیں، لیکن دلوں میں ان کی یاد برابر قائم رہتی ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جو کسی اعلیٰ مقصد کے لیے جیتے ہیں اور زندگی بھر اِس کے لیے قربانیاں دیتے ہیں۔ مصر کی اسلامی تحریک "اخوان المسلمون" کے بانی اور رہنما حسن البنّا مرحوم بھی ایک ایسی ہی غیر معمولی شخصیت تھے جس نے تاریخ پہ انمٹ اثرات چھوڑے۔ لاکھوں دلوں میں اُن کی یاد آج بھی موجزن ہے۔

اکابر کی رائے

ان کے عقیدت مند انہیں جدید دَور کے مصلحین اور داعیانِ حق کا سرخیل قرار دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ وہ مفتی محمد عبدہٗ کی جدتِ فکر اور جمال الدین افغانی کی شجاعت کے جامع تھے، مگر اِس لحاظ سے دونوں سے بڑھے ہوئے تھے کہ انہوں نے دینِ حق کی سربلندی کے لیے کام کرنے والی ایک عظیم جماعت "اخوان المسلمون" قائم کی جب کہ ان دونوں بزرگوں کا کام بڑی حد تک نظریات اور اصولوں تک محدود رہا۔

مصر کے پہلے صدر جنرل محمد نجیب نے حسن البنّا کی شہادت کے بعد ان کی قبر پہ کھڑے ہو کر یہ الفاظ کہے:

"صاحبِ عقیدہ...... فساد اور غیر اخلاقی رویّوں کے خلاف جہاد کرنے والا....

غیر ملکی استعمار کا دشمن ...... جو ملک و قوم کے لیے زندہ رہا اور انہیں پر اپنی جان نچھاور کر گیا۔"

جمال عبدالناصر کے سامنے پہلے پہل ان کا ذکر ہوا تو اُس نے کہا:

"حسن البنّا کی شخصیت ایسی ہے کہ ان کا مخاطب ان کا احترام کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔"

انور سادات کا کہنا ہے کہ:

"میں نے پہلی دفعہ حسن البنّا کو دیکھا تو وہ ایک سُرخ عبا اوڑھے ہوئے تھے۔ جسم سے تواضع اور چہرے سے بشاشت نمایاں تھی۔ عام علمائے دین کے برعکس ان کی گفتگو کا انداز واعظانہ تھا، نہ عالمانہ اور بوجھل۔ وہ سیدھے سادھے الفاظ اور عام سے انداز میں گفتگو شروع کر کے اپنے اصل موضوع پر آ جاتے تھے۔ لیکن ان کی اپروچ واضح اور دلکش ہوتی تھی۔"

ایک اور مصری لیڈر احمد مرتضیٰ المراغی نے حسن البنّا کی شخصیت اور سراپا کا نقشہ اس طرح کھینچا ہے:

"ان کی ڈاڑھی لمبی تھی نہ بہت مختصر۔ چلتے تو ہلکے ہلکے اور تیز قدم اُٹھاتے۔ گفتگو میں بھی کسی قدر تیزی ہوتی۔ آنکھوں سے ذہانت ٹپکتی تھی۔ نگاہیں مخاطب کے چہرے پر مرکوز کر دیتے۔ نرم مزاج اور شیریں گفتار تھے۔ ان سے گفتگو کرنے والا کبھی اکتاہٹ محسوس نہ کرتا تھا، کیونکہ طبیعت میں خشکی یا روکھا پن نہ تھا۔"

"اخوان المسلمون" کے موجودہ صدر شیخ عمر تلمسانی جو کہ سالہا سال حسن البنّا کے ساتھ مل کر دعوت و تبلیغ کا کام کرتے رہے، اپنے لیڈر کے بارے میں یوں رائے زنی کرتے ہیں:

"وہ دل و دماغ کی غیر معمولی صلاحیتوں کے مالک تھے۔ اسلام کے لیے ان کی جدوجہد اتنی انتھک اور قربانیاں اتنی عظیم ہیں کہ عقل دنگ رہ جاتی ہے۔ صاحب فراست اور صائب الرائے تھے۔ سب کے استاد اور رہنما ...... اپنی قوم کو داخلی اور خارجی فتنوں سے بچانے والے ......"

مولانا مودودیؒ کی رائے :

"حسن البنا کی دعوت مؤثر، دل میں اُتر جانے والی اور شرابِ معرفت کی حلاوتوں سے پُر تھی - انہوں نے اسی زمانے میں مصر میں "اخوان المسلمون" قائم کی جب ہمارے ملک میں جماعتِ اسلامی نے سفر کا آغاز کیا - اُصول و مقاصد کے لحاظ سے دونوں تحریکوں میں سرِ مو فرق نہیں - ہم دونوں کی منزل بھی ایک تھی اور راستہ بھی ایک - عرب ممالک میں اسلام کا جو کام آگے بڑھ رہا ہے - دینی و اخلاقی شعور بیدار کرنے کے لیے جو کوشش ہو رہی ہے اور مسلم عوام و خواص کے سامنے اسلام کی صحیح اور کامل تصویر پیش کرنے کی جو سعی و جہد ہوئی ہے وہ سب نتیجہ ہے اس تحریکِ اسلامی کی دل سوزیوں اور سرفروشیوں کا جو امام حسن البنا شہید نے قائم کی تھی"۔

مولانا ابوالحسن علی ندوی کی رائے :

" ان کی شخصیت انقلاب آفرین تھی - روشن دماغی، محبت و دردمندی، فصاحت و بلاغت، تسخیر کر لینے والے اخلاق ـــــ یہ ہیں اُن کی دل آویز شخصیت کے عناصرِ ترکیبی - وہ اقبالؒ کے اس شعر کے مصداق تھے۔

> ؎ نگہ بلند سخن دل نواز جاں پُر سوز
> یہی ہے رختِ سفر میرِ کارواں کے لیے"

مختصر حالاتِ زندگی

حسن البنا ۱۹۰۶ء میں اسکندریہ کی ایک مضافاتی بستی محمودیہ میں پیدا ہوئے - ان کے والد شیخ احمد البنا بستی کی مسجد کے امام و خطیب اور پیشے کے لحاظ سے گھڑی ساز تھے - وہ مفتی محمد عبدہ کے شاگرد تھے - ان کے پاس کافی بڑی لائبریری تھی اور وہ خود کئی دینی کتابوں کے مصنف تھے - حسن البنا کی ابتدائی تعلیم و تربیت اسی دینی ماحول میں ہوئی -

بڑے ہوئے تو اُن کی شادی اسماعیلیہ کے ایک معزز خاندان میں ہوئی - وفات کے وقت ان کی پانچ بیٹیاں اور ایک بیٹا تھا جس کی عمر اُس وقت صرف چار سال تھی - ایک بچی والد کی وفات کے بعد پیدا ہوئی -

زمانۂ طالب علمی میں انہوں نے کئی انجمنوں کی تشکیل و تنظیم میں حصّہ لیا۔ جن میں سے ایک "جمعیتِ انسدادِ محرمات" تھی جس کے وہ صدر تھے۔ اس جمعیت کے ارکان محرمات کا ارتکاب کرنے والے افراد کی خط و کتابت کے ذریعے اصلاح کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ اس خط و کتابت کا ریکارڈ خفیہ رکھا جاتا تھا۔ ان انجمنوں کے ذریعے جہاں انہوں نے بہت سے نوجوانوں پر دینی اور اصلاحی اثرات چھوڑے وہاں ان کی اپنی تنظیمی اور قائدانہ صلاحیتوں کو بھی جِلا ملی۔

حسن البنا ابھی تیرہ سال کے تھے کہ جلسوں اور جلوسوں میں شرکت کرنے لگے۔ ایک سال بعد انہوں نے ٹیچرز ٹریننگ سکول میں داخلہ لیا۔ جہاں انہوں نے دوسرے مضامین کے علاوہ فقہ اسلامی پڑھی نیز اٹھارہ ہزار شعر اور اتنے ہی نثر پارے حفظ کیے بعد میں انہوں نے قرآنِ پاک بھی حفظ کر لیا۔ اسی زمانہ میں انہوں نے امام غزالی کی کتب کا مطالعہ بھی کیا اور ان کے فلسفیانہ افکار کا بغور جائزہ لیا۔

حسن البنا ایک دردمند دل رکھتے تھے۔ وہ مسلمانوں کے زوال کو دیکھتے تو اُن کا دل کُڑھتا کتنی ہی راتیں عالمِ اسلام کے مسائل پر غور و فکر کرنے میں گزار دیں۔ ان کا خیال تھا کہ مسلمان اپنے دینی مقاصد سے دُور ہو گئے ہیں اور قرآن پاک نے زندگی کا جو تصور دیا ہے اُسے صحیح طور پر سمجھنے میں کوتاہی کر رہے ہیں۔ چنانچہ انہوں نے اصلاحی کام کا آغاز کیا اور لوگوں کو یہ سمجھانے کی کوشش شروع کر دی کہ اسلام دین اور دُنیا دونوں کا جامع ہے انہوں نے کہا کہ مغربی قومیں جو اسلامی ملکوں پر مسلط ہیں قرآن سے اس لیے ڈرتی ہیں کہ وہ یہ جانتی ہیں کہ اس کی آیات محض نمازوں میں پڑھنے اور دہرانے کی چیز نہیں، بلکہ ان میں زندگی کے لیے قوانین بھی ہیں، حکمرانی اور قیادت کے اُصول بھی ہیں۔ حسن البنا نے بار بار اس پر زور دیا کہ اسلام محض عقیدے اور نماز روزے کا دین نہیں، بلکہ ایک مکمل نظام ہے اور زندگی کے سارے ہی شعبوں میں رہنمائی کرتا ہے۔ اس کا مطلب تو یہ ہے کہ ہم پوری زندگی کو اسلام کے رنگ میں رنگ دیں۔

دعوت کا کام

مختلف انجمنوں اور اخبارات کے ذریعے دعوت و تبلیغ کا کام

تو وہ کر رہے تھے۔ اب انہوں نے اس مقصد کے لیے ایک دلچسپ اور منفرد انداز اختیار کیا۔ انہوں نے تین بڑے چائے خانوں کا انتخاب کیا۔ ہفتے میں دو دفعہ ایک میں جاتے اور ان لوگوں سے خطاب کرتے جو اس وقت چائے خانے میں موجود ہوتے۔ لوگ ان کی باتیں توجہ اور دلچسپی سے سنتے۔

۱۹۲۸ء میں حسن البنا نے اسماعیلیہ میں تحریک "اخوان المسلمون" کی بنیاد رکھی۔ اس نیک کام کا بیڑا اٹھانے والے افراد کی تعداد صرف چھ تھی۔ اس وقت کوئی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ یہ مختصر سی تنظیم آگے چل کر ایک عظیم الشان تحریک کی صورت اختیار کرے گی اور لاکھوں انسانوں کی زندگیوں کا رخ موڑ دے گی، مگر ان چھ افراد کے بے پایاں اخلاص کو اللہ تعالیٰ نے شرف قبولیت بخشا اور ان کی کوششوں میں برکت پیدا کی۔ چند سالوں میں اس کی ہزاروں شاخیں مصر کے اکناف و اطراف میں قائم اور سرگرم عمل ہو گئیں۔ اخوان کے پیش نظر ایک طرف دینی اصلاح و تربیت کا پروگرام تھا۔ دوسری طرف سیاسی حالات میں تبدیلی لانے کا کام۔ عوام میں ان کی کوششوں سے زبردست دینی اور سیاسی بیداری پیدا ہو گئی۔ مصر پر ان دنوں برطانوی استعمار قابض تھا۔ اور مصری حکومت محض کٹھ پتلی تھی۔ "اخوان المسلمون" کی ابھرتی ہوئی سیاسی قوت سے مصری حکومت خوف محسوس کرنے لگی۔

آزمائشوں کا دور

"اخوان المسلمون" واحد جماعت تھی جو دینی اور سیاسی دونوں محاذوں پر سرگرم عمل تھی۔ اس جماعت کے بانی بھی تمام دینی جماعتوں میں منفرد قسم کے لیڈر تھے۔ وہ انگریزی لباس پہنتے تھے (حالانکہ انگریزی زبان نہیں جانتے تھے)، اور سر پر ترکی ٹوپی رکھتے تھے۔ حکومت نے حسن البنا کو پہلے تو حرص و آز کے شیشے میں اتارنے کی کوشش کی۔ انہیں کہا گیا کہ اگر وہ اخوان کی تنظیم و تربیت کے کام سے دست کش ہو جائیں تو انہیں اس کے بدلے میں بہت بڑی رقم نقد ادا کی جائے گی نیز پرائمری سکول کے بجائے ان کا تقرر یونیورسٹی میں بطور پروفیسر کر دیا جائے گا۔ حسن البنا نے اس پیش کش کو ٹھکرا دیا اور کہا کہ مجھے اس کی ضرورت نہیں۔ اس چال میں کامیابی نہ ہوئی تو یہ الزام

ترشا گیا کہ "اخوان المسلمون" کو باہر سے امداد ملتی ہے۔ یہ پروپیگنڈا بھی کیا گیا کہ یہ تنظیم نازیت اور فاشیت سے ملتی جلتی ہے۔ یہ بھی کہا گیا کہ حسن البنا خلیفۃ المسلمین کا منصب حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ حالانکہ حسن البنا کی شخصیت میں جس قدر تواضع اور زہد تھا وہ کسی دُنیا پرست اور جاہ پسند شخص میں ممکن ہی نہیں۔ غرض حسن البنا اور ان کے ساتھیوں کو ہر قسم کی صعوبتیں اور قید و بند کی سختیاں جھیلنی پڑیں، مگر انہوں نے اپنے مشن کو جاری رکھا۔

زندگی کے آخری سالوں میں حسن البنا کے ذاتی اوصاف کمال پر تھے۔ وہ مشکلات کو ذرا بھی خاطر میں نہ لاتے تھے۔ مسائل کا چیلنج قبول کرنے اور آگے بڑھ کر قربانیاں دینے کے لیے ہمہ وقت مستعد رہتے تھے۔ انہیں موت کا قطعاً خوف نہ تھا۔ آخری ایام میں انہیں معلوم ہوگیا تھا کہ انہیں قتل کرنے کی خفیہ تدبیریں کی جا رہی ہیں۔ چنانچہ ان کے بعض دوستوں اور خیرخواہوں نے حالات کی نزاکت کا احساس کرتے ہوئے انہیں سازشوں سے بچانے کے لیے بعض تدابیر اختیار کیں۔ اس ضمن میں انہیں بھیس بدلنے اور روپوش رہنے کا مشورہ بھی دیا گیا، لیکن انہوں نے اسے قبول نہ کیا۔ ایسے وقت میں جب کہ "اخوان المسلمون" کی تحریک نازک مرحلے سے گزر رہی تھی۔ اور قدم قدم پر ان کی رہنمائی کی ضرورت تھی، انہوں نے روپوش ہونا یا تنہائی اختیار کرنا گوارا نہ کیا بلکہ مومنانہ شجاعت کے ساتھ اپنی موت کا انتظار کیا اور اس دوران اپنے مشن کو جاری رکھا، چنانچہ وہی ہوا جس کا اندیشہ تھا۔ ۱۲ فروری ۱۹۴۹ء کو انہیں بزدل دشمنوں نے اس وقت گولی کا نشانہ بنایا جب وہ ایک ٹیکسی میں سوار ہو رہے تھے۔ ان کی جرأت ملاحظہ ہو۔ گولی کھا کر وہ ٹیکسی سے باہر نکلے اور ٹیلیفون کر کے ہسپتال سے اپنے لیے ایمبولینس طلب کی۔ چنانچہ انہیں قصر العینی ہسپتال لے جایا گیا جہاں مرہم پٹی کے لیے انہیں کوئی ڈاکٹر دستیاب نہ ہو سکا۔ اور تھوڑی دیر بعد وہیں مظلوم امام کا انتقال ہوگیا۔ وہ کلمۂ شہادت پڑھتے ہوئے اپنے خالق سے جا ملے ؎

بنا کردند خوش رسمے کہ بہ خاک و خون غلطیدن خدا رحمت کند ایں عاشقانِ پاک طینت را

زہد و ورع تمام معاصر اس بات پر متفق ہیں کہ حسن البنا ایک قوی شخصیت کے مالک تھے۔ زاہد حقیقی تھے۔ انہیں مال کی حرص نہ تھی نہ دوسری دنیوی اشیاء جمع کرنے کی فکر۔ بس اتنا کافی سمجھتے کہ ضروریات پوری ہوتی رہیں۔ صرف پانچ گھنٹے سوتے تھے۔ کھانے میں جو کچھ سامنے رکھا جاتا کھا لیتے۔ جیسے کپڑے مل جاتے پہن لیتے۔ جب کسی شہر یا گاؤں میں جاتے تو جماعت کے لوگوں کے پاس قیام کرتے۔ یہ صورت نہ ہوتی تو مسجد ہی میں رات گزار لیتے۔ قیام قاہرہ کے آغاز میں کرائے کے معمولی سے مکان میں رہتے تھے۔ کمرے میں ایک چٹائی پڑی رہتی تھی۔

وہ ایک پرائمری سکول میں مدرس تھے۔ محکمۂ تعلیم سے دس مصری پونڈ ماہانہ تنخواہ ملتی تھی۔ اسی رقم سے اپنا اور بیوی بچوں کا خرچ بھی چلاتے اور دعوت و تبلیغ کے سفر کے مصارف بھی پورے کرتے۔ مدرسی سے استعفا دینے کے بعد ایک رسالہ "شہاب" نکالنے لگے۔ تب بھی ان کا ماہوار خرچ پندرہ پونڈ سے تجاوز نہ کرتا تھا۔ جماعت کے لوگوں نے پیش کش کی کہ سو پونڈ ماہانہ گزارے کے لیے قبول کر لیجیے اور جماعت کے کام کے لیے فارغ ہو جائیے' لیکن انھوں نے قبول نہ کیا۔ برطانوی خفیہ پولیس کے کارندوں نے اپنی رپورٹ میں لکھا کہ ان کے خیالات کے تیزی سے پھیلنے کی بڑی وجہ ان کا زہد اور پرہیزگاری ہے۔

ان کی شہادت کے وقت ان کے پاس سے جو نوٹ بک برآمد ہوئی اس سے معلوم ہوا کہ انھوں نے منیر منیر الدولہ سے ایک سو پچاس پونڈ گھریلو اخراجات کے لیے قرض لے رکھے تھے۔ قصر العینی ہسپتال میں جہاں اُن کی وفات ہوئی اُن کی جیب سے یہ چیزیں برآمد ہوئیں:

چھ پونڈ سے کچھ زیادہ رقم، ایک سستی سی گھڑی اور ایک قلم۔ جس ٹیکسی کے ذریعے وہ ہسپتال پہنچے تھے اس سے ایک ننانوے دانوں کی تسبیح بھی ملی۔

یہ تھا اس شخص کا حال جس کے ہزاروں نہیں لاکھوں عقیدت مند تھے جو اس کے ایک اشارے پر جانیں نچھاور کرنے کے لیے تیار و مستعد رہتے تھے۔

ایک عظیم مصلح اور داعی حسن البنا کی شخصیت اپنی گوناگوں خوبیوں اور کمالات کی وجہ سے بڑی ہی پُرکشش تھی، مگر ان کا نمایاں ترین وصف یہ تھا کہ وہ بے حیائی، فسق و فجور اور باطل

کے خلاف احتجاج کی ایک چنگاری تھے ـــــ ایسی چنگاری جو ایک لمحے کے لیے بھی سرد نہ ہو۔ اُن کو وہ سچا ہوا ایمان کبھی راس نہ آیا جو صاحبِ ایمان کو متحرک اور بے تاب نہ کر دے۔ چنانچہ اپنی تقریروں اور تحریروں کے ذریعے اپنا سوز و تپش دوسروں میں منتقل کرتے اور اُن کے دلوں کو گرماتے رہے۔ ہمیں وہ لڑکپن کے زمانے ہی سے طلبہ کی انجمنوں کے لیڈر اور اصلاحی تنظیموں کے قائد کی حیثیت سے کام کرتے نظر آتے ہیں۔

سیرت نگاروں نے اُن کے بچپن کا ایک عجیب واقعہ لکھا ہے جو اُن کے اس پیدائشی وصف پر روشنی ڈالتا ہے۔ حسن البنا ابھی بہت کم سِن تھے۔ ایک دن اپنے گاؤں کے قریب بہنے والی ندی کی طرف جا نکلے۔ وہاں انہوں نے **ایک** کشتی پر ایک مورتی آویزاں دیکھی۔ وہ اسی وقت قریبی پولیس چوکی پر گئے اور اس مورتی کے خلاف احتجاج کیا۔ پولیس افسر معصوم حسن البنا کی غیرتِ ایمانی سے متاثر ہوا۔ چنانچہ وہ خود اٹھ کر گیا اور اس مورتی کو وہاں سے اُتروا دیا۔

یہ دعوتی اور اصلاحی کام انہوں نے مسجدوں اور مدرسوں میں بھی کیا اور ہوٹلوں اور چائے خانوں میں بھی لوگوں کو وعظ و تلقین کی۔ جہاں براہِ راست لوگوں سے ملنے اور گفتگو کرنے کا موقع نہ ملا وہاں خطوط کے ذریعے انہیں بُرائیوں اور معصیت کاریوں سے دُور رہنے کی تاکید کی۔ آگے چل کر تقاریر کے علاوہ اخبارات و رسائل کے ذریعے دعوت و تبلیغ کے کام کو آگے بڑھایا۔ علمائے وقت کو جھنجوڑا اور انہیں گوشۂ عزلت سے نکلنے پر مجبور کیا۔ ان کی شخصیت میں ایک عجیب قسم کی قوتِ تسخیر تھی۔ یہ ممکن نہ تھا کہ کوئی سلیم الفطرت انسان ان سے ملے اور ان کی سادگی اور اخلاص سے متاثر نہ ہو۔

"اخوان المسلمون" کے قیام کے بعد دعوت کا کام تیزی سے پھیلا۔ اس تحریک کی مقبولیت کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ صرف مصر میں اس کے باقاعدہ ممبروں کی تعداد پانچ لاکھ تک پہنچ گئی جب کہ منسوب ممبروں اور ہمدردوں کی تعداد اس سے کئی گنا زیادہ تھی۔ مصر کے علاوہ سوڈان، شام، اردن، لبنان، فلسطین اور شمالی افریقہ میں بھی "اخوان المسلمون" کی شاخیں قائم ہو گئیں۔

ہمارے لیے سبق حسن البنا شہید کی زندگی میں ہمارے لیے کئی سبق ہیں۔ ایک پہلو جس کی طرف اس وقت میں توجہ دلانا چاہتا ہوں یہ ہے کہ انہوں نے تجدید واحیائے دین کی تحریک چلائی تو اس کے لیے قید و بند کی صعوبتیں جھیلیں، اذیتیں برداشت کیں۔ اور ہر قسم کی قربانیاں دیں، مگر کبھی مصلحت بینی سے کام نہ لیا۔ خطرات اور اندیشوں کو کبھی خاطر میں نہ لائے، بلکہ اپنے مشن کے لیے اپنی ساری توانائیاں صرف کر دیں، حتیٰ کہ اپنا سر بھی اس پر نثار کر دیا۔ آج ہم بھی اگر تجدید و اقامتِ دین کا کام کرنا چاہتے ہیں تو ہمیں بھی اسی سرفروشی و جان نثاری کا نمونہ پیش کرنا ہوگا۔ اور اسی دیوانگی شوق کا ثبوت دینا ہوگا۔ بقول شاعر ؎

یہ شہادت گہِ اُلفت میں قدم رکھنا ہے
لوگ آسان سمجھتے ہیں مسلمان ہونا!

(اس مضمون کی تیاری میں لندن سے شائع ہونے والے رسالے "المسلمون" کے بعض شماروں، نیز مجاہد کی اذان، سے استفادہ کیا گیا ہے)۔

احتیاط

ترجمان القرآن میں ضرورتِ استدلال کے لیے آیات واحادیث شائع ہوتی رہتی ہیں۔ قارئین سے گذارش ہے کہ جن اوراق پر آیات و احادیث ہوں۔ ان کا خاص احترام ملحوظ رکھیں تاکہ بے ادبی نہ ہونے پائے۔ (ادارہ)

اسلامی تہذیب یک تخمی بہار ہے

جناب پروفیسر محمد سلیم صاحب

اسلامی علوم و فنون اور اسلامی تہذیب پر لکھنے والوں کے لیے چند بنیادی اُمور کا ذہن میں مستحضر رکھنا نہایت ضروری ہے۔ عام طور پر مصنفین اس کی جانب سے غفلت برتتے ہیں۔ جس کے بعد وہ غلط راہوں میں نکل جاتے ہیں۔

اس اُمت پر اللہ تعالیٰ کے جو عظیم احسانات اور انعامات ہیں، ان میں سے ایک یہ ہے کہ اُس نے ہادیٔ عالم اور داعی اعظم حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم پر ۲۳ سال کی طویل مدت میں آخری صحیفۂ ہدایت قرآن مجید نازل فرمایا، دینِ حق کی تکمیل فرمادی اور فرمایا:

"آج میں نے تمہارے لیے دین کو مکمل کر دیا ہے اور اپنی نعمت تم پر تمام کر دی ہے۔ اور تمہارے لیے اسلام کو تمہارے دین کی حیثیت سے قبول کر لیا ہے۔"

یہ اعلانِ حق اس امر کی ضمانت دیتا ہے کہ دینِ اسلام نوعِ انسانی کی انفرادی، اجتماعی اور بین الاقوامی رہنمائی اور رہبری کے لیے واحد کتابِ ہدایت اور ضابطہ ہدایت ہے۔ اب کسی دوسرے در پر دستک دینے کی ضرورت نہیں ہے۔ یہ ہدایت نامہ تمام اقوامِ عالم کے لیے ہے۔ اور قیامت تک کے لیے جاری اور نافذ رہے گا۔ مقصودِ حیات اور اختتامِ حیات کی فلسفیانہ بھول بھلیوں میں بھٹکنے سے رب کریم کی رحمت نے انسانوں کو بچا لیا۔

اس کتابِ ہدایت کو مسلمانوں نے اپنی اصل حالت میں محفوظ رکھا۔ اصل مصحفِ عثمانی

کے نسخے بھی آج تک موجود ہیں۔ اوّل روز سے ہر دور اور ہر ملک میں لاکھوں انسانوں کے سینہ میں یہ کتاب محفوظ رہی ہے۔ اس طرح خدائی وعدہ پورا ہوا "ہم نے یہ ذکر (قرآن) نازل کیا ہے اور ہم ہی اس کے محافظ ہیں"۔

دوسرا انعام یہ ہے کہ یہ دین ایسی سرزمین پر نازل ہوا، جہاں ماضی میں نہ کبھی کوئی حکومت تھی نہ کوئی سلطنت۔ نہ وہاں تمدن کی رونق تھی نہ علوم و فنون کی گرم بازاری۔

ع۔ بے جہتی تھی یہ ساری خدا کی زمین

اس لیے یہاں کے رہنے والے انسانوں کے اذہان صاف اور سادہ تھے۔ فکری زیغ اور تمدنی بیماریوں سے محفوظ تھے۔ اس لیے جب یہ دین وہاں نازل ہوا تو اپنی اصلی حالت میں محفوظ رہا۔ بیرونی اور خارجی کسی قسم کی آمیزش اور ملاوٹ اس میں نہ ہو سکی۔ یہ سب کو معلوم ہے کہ دوسرے ادیان میں اور دوسری کتابوں میں ان کے پیروکاروں نے آمیزش کی اور ملاوٹ کی حتٰی کہ کتاب میں تحریف کر دی اور اس دین کا حلیہ بگاڑ ڈالا اور اس کی صورت مسخ کر ڈالی۔

تیسرا انعام یہ ہے کہ داعی اور ہادی نے اپنی زندگی میں اس دین کو عملاً برپا کر دیا۔ زندگی کے تمام گوشوں میں دین کے احکام نافذ کر دیئے۔ دین خالص کی بنیادوں پر ایک اسلامی معاشرہ تشکیل دے دیا۔ ایک ہیئت حاکمہ۔ خلافت نبوت۔ قائم کر دی۔ اس طرح جو دین نافذ ہوا وہ خالص تھا۔ جو معاشرہ تشکیل پایا وہ صحیح بنیادوں پر استوار ہوا۔ جو خلافت تھی وہ علی منہاج نبوت پر قائم تھی۔ اس لیے یہ ایک مثالی معاشرہ تھا اور مثالی حکومت تھی۔ یہ نمونہ رہتی دنیا تک کے لیے معیاری نمونہ ہے۔

اس معیاری نمونہ کو اصطلاحی زبان میں سنت رسول اور احادیث رسول کہتے ہیں۔ یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے وہ اقوال اور افعال ہیں جو اس نمونہ کے برپا کرنے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے استعمال فرمائے۔ صحابہ کرام نے ان سب کو محفوظ کر لیا۔ ان کی تعداد بارہ ہزار سے زیادہ نہ ہوگی۔ مگر اس سلسلہ میں صحابہ کرام اور بعد میں محدثین عظام کا کمال یہ ہے کہ ان اقوال کے جتنے مختلف VERSION ہو سکتے تھے، جتنے مختلف راوی ہو سکتے تھے، ان سب کو انہوں نے محفوظ کر لیا۔ ان اقوال کے بیان کرنے والے راویوں کی تعداد عہد بہ عہد کوئی پانچ لاکھ ہوتی

ہے۔ محدثین کرام نے ان کے بیان کو جانچنے کے لیے ان کی سوانح حیات جمع کیں۔ اس طرح کوئی پانچ لاکھ افراد کی سوانح حیات محفوظ کر لیں۔ یہ دوسرا عظیم کارنامہ ہے۔ اس طرح چھ صدیاں مسلمانوں نے احادیث کی چھان پھٹک میں بسر کر دیں۔ اور بالآخر مجموعہ احادیث کو صاف ستھرا بنا کر پیش کر دیا۔ دوسری کوئی قوم اس خصوصیت میں مسلمانوں کے پاسنگ بھی نہیں ہے۔

چوتھا بڑا انعام یہ ہے کہ داعی کی وفات کے بعد اس کے مستند اور معتبر ترین شاگردوں یعنی خلفاء نے مدینہ کی نئی طرز کی ریاست کی سربراہی اختیار کی۔ جہاں انہوں نے ریاست کی وسعت میں جزیرۃ العرب بلکہ ہمسایہ ملکوں تک کو شامل کر لیا۔ وہاں پوری مملکت میں اعتقادات و عبادات، اخلاق و عادات، تعلیم و تربیت، معیشت و معاشرت، ریاست و حکومت، قانون و عدالت، تقویٰ و خدا خوفی کی فضا کو عام کر دیا۔ سارے افراد بدل گئے، سارا معاشرہ بدل گیا۔ ایک نیا جہاں پیدا ہو گیا۔ نئے ولولے اور نئی امنگیں دلوں میں موجزن ہو گئیں۔ جہاں نظام اجتماعی کے تمام شعبے کارفرما تھے۔ جہاں شریعت اسلامیہ پوری طرح نافذ العمل تھی۔

اسلام میں علوم و فنون کی گرم بازاری اور ریاست حکومت کے چرچے سب اسلام کے بعد ہوئے ہیں۔ سب قرآن و سنت سے ماخوذ ہیں۔ علوم و فنون کی ایجاد و انکشاف میں عرب قوم کسی دوسری قوم کی ممنونِ احسان نہیں ہے۔ انہوں نے کسی دوسری قوم کے سامنے زانوئے تلمذ تہ نہیں کیا۔ شریعت و قانون میں کوئی بیرونی آمیزش اور ملاوٹ نہیں ہوئی۔ اس طرح دنیا کی تاریخ میں اسلام واحد دین اور واحد نظامِ حیات اور نظامِ فکر ہے جو ابتدائی نصف صدی بلاکم و کاست اپنی اصلی حالت میں چلتا رہا ہے۔ اس عرصہ میں کسی خارجی تہذیب اور کسی خارجی تمدن کا اس پر پرتو نہیں پڑا۔ کسی سے اس کو داد و ستد کا معاملہ نہیں کرنا پڑا۔ کسی قوم کی آمیزش اور ملاوٹ نہیں ہوئی۔ داخلی قوتِ حیات سے اسلامی تہذیب خود بخود وسعت پذیری کرتی رہی۔

جب اسلامی تصورات مستحکم ...... اور مضبوط ہو گئے۔ تب اسلامی تہذیب کا واسطہ دوسری تہذیبوں اور دوسرے تمدنوں سے پڑا ہے۔ اس وقت دین کے سرچشمے صاف و شفاف جاری و ساری ہو چکے تھے۔ یہ محفوظیت بھی قرآن کی حفاظت کا ایک جلوہ ہے جس کا وعدہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے۔ محفوظیت اور خالص ہونے کا یہ شرف بھی صرف دین اسلام کو حاصل

ہے، اور نہ ہمیں معلوم ہے کہ دوسرے ادیان کے دستیاب مآخذ غایت درجے گدلے ہیں۔ وہاں اس حقیقت کی سراغ رسانی کرنا جوئے شیر لانے سے کم نہیں۔

دُنیا جہاں کی ساری تہذیبیں تالیفی اور امتزاجی (SYNTHETIC) ہیں۔ ان سب کے برخلاف اسلامی تہذیب یک تخمی بہار (بے آمیز) ہے ــــــ جس طرح ایک بیج سے تناور اور چھتنار درخت پروان چڑھتا ہے۔ اسی طرح کتاب و سنت کی بنیاد پر اسلامی تہذیب پروان چڑھتی ہے۔ دُنیا کی ساری تہذیبیں تالیفی مجموعے ہیں۔ یہ اگر کوئی درخت ہے تو ایک ایسا درخت ہے جس میں بھانت بھانت کی شاخیں جوڑ دی گئی ہیں۔ ان تہذیبوں کی مثال اس نادان بچے کی سی ہے جو ساحلِ سمندر پر خوش رنگ پتھروں سے اپنی جھولی بھر لیتا ہے۔ ان تہذیبوں میں حق کے ساتھ باطل کی بھی آمیزش ہے۔ حقیقت روایت میں گم ہو گئی ہے۔

ان کے برعکس اسلامی تہذیب کی بنیاد قرآن و سنت کے ابدی سرچشموں پر رکھی ہے۔ یہ سرچشمے آج بھی صاف اور شفاف حالت میں موجود ہیں۔ آج بھی کھرے اور کھوٹے کی تمیز ہو سکتی ہے۔ اس تہذیب کے مختلف اجزا کے درمیان منطقی ربط موجود ہے۔ ان کے درمیان یک رنگی اور یکسانیت کی رُوح کارفرما ہے۔ دوسرے لوگ فخر کرتے ہیں کہ ان کی تہذیب جامع ہے۔ ہاں رطب و یابس کی جامع ہے۔ اسلام اس بات پر فخر کرتا ہے کہ اس کی تہذیب خالص ہے اور نمو پذیر ہے، مگر بیرونی آمیزش سے محفوظ ہے۔

اسلامی تہذیب کے تالیفی ہونے کا شور مستشرقین گذشتہ صدی سے مچا رہے ہیں۔ اس شور و غل کا محرک معلوم ہے۔ وہ اسلامی تہذیب کو کسی نہ کسی طرح "تالیفی" قرار دے کر یہ چاہتے ہیں کہ اسلامی تہذیب میں مزید ملاوٹ کا دروازہ کھول دیا جائے تاکہ وہ جدید مغربی تصورات اور ادارات کو بغیر کسی ذہنی تحفظ کے اسلام میں داخل کر دیں۔ اور اس طرح اسلام کی یک رنگی کو مجروح کر دیں۔ ان کی نیتیں فاسد ہیں۔ ان کے ارادے خراب ہیں۔ ان سے متاثر ہو کر بعض مغرب زدہ مسلمان بھی اسلامی تہذیب کے تالیفی ہونے کا ترانہ الاپنے لگے ہیں۔ ان بیچاروں کو نہ اسلام کی خبر ہے اور نہ مستشرقین کی نیتوں کی خبر ہے۔

مطالعۂ قرآن

سورہ ہائے الفلق والنّاس

جناب میر محمد حسین صاحب - ایم اے - فاضل دیوبند

اگرچہ ان دونوں سورتوں کے مکی یا مدنی ہونے میں علماء کے درمیان اختلاف رائے پایا جاتا ہے مگر ان دونوں سورتوں کی اندرونی شہادت ان کے مدنی ہونے کی تائید کرتی ہے۔ کیونکہ پہلی سورت میں مخلوق، رات کی تاریکی، جھاڑ پھونک کرنے والے نفوس اور حسد کرنے والے کے حسد سے خدا کی پناہ طلب کرنے کی تلقین کی گئی ہے۔ جھاڑ پھونک کا عمل عموماً اس طبقے میں رائج ہوتا ہے جو اپنے آپ کو کسی خاص مذہب سے وابستہ کرتا ہے مگر اس کا عمل، اس مذہب کی اصل تعلیمات پر عمل پیرا ہونے کے بجائے اس میں راہ پا جانے والے ٹونے ٹوٹکوں اور شعبدہ طرازیوں تک محدود ہوتا ہے اور جیسا کہ قرآن مجید نے بتایا ہے کہ یہ طرز عمل مدینہ کے یہود میں رواج پا چکا تھا۔ سورۂ البقرہ میں یہود کے کردار کی تفصیل بیان کرتے ہوئے بتایا گیا کہ

وَاتَّبَعُوْا مَا تَتْلُوا الشَّيٰطِيْنُ عَلٰى مُلْكِ سُلَيْمٰنَ وَمَا كَفَرَ سُلَيْمٰنُ وَلٰكِنَّ الشَّيٰطِيْنَ كَفَرُوْا يُعَلِّمُوْنَ النَّاسَ السِّحْرَ وَمَآ اُنْزِلَ عَلَى الْمَلَكَيْنِ بِبَابِلَ هَارُوْتَ وَمَارُوْتَ ...... (البقرہ ۲-۱۰۲)

(اور لگے ان چیزوں کی پیروی کرنے جو شیاطین سلیمان کی سلطنت کا نام لے کر پیش کیا کرتے تھے۔ حالانکہ سلیمان نے کبھی کفر نہیں کیا، کفر کے مرتکب تو وہ شیاطین تھے جو لوگوں کو جادوگری کی تعلیم دیتے تھے۔ وہ پیچھے پڑے اس چیز کے جو بابل میں دو فرشتوں ــــ ہاروت و ماروت پر نازل کی گئی تھی)۔

ایسے لوگ رات کی تاریکی ہی کو اپنے ان اسفل اعمال کے لیے منتخب کرتے ہیں اور طرح طرح

کی مخلوق کو اپنے دشمن کے درپے آزار بنانے کی کوشش کرتے ہیں۔ اسی لیے ہر طرح کی مخلوق اور تاریکی کے شر سے بھی تحفظ کے لیے دُعا کی تلقین کی گئی۔

پھر حسد ہمیشہ کسی شخص سے اُس وقت کیا جاتا ہے جب وہ شہرت، عزت اور اقتدار وغیرہ میں ترقی کر رہا ہوتا ہے اور یہ مرتبہ و مقام رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو مدینہ ہی میں آکر حاصل ہوا جب انہیں مدینہ کا حاکم مطلق مان لیا گیا اور آپ پہ وہاں کی اکثریت ایمان لانے لگی۔ قرآن مجید نے یہود کی جو اخلاقی برائیاں گنوائی ہیں اُن میں سے ایک حسد بھی ہے۔ چنانچہ فرمایا: وَدَّ كَثِيرٌ مِّنْ أَهْلِ الْكِتَٰبِ لَوْ يَرُدُّونَكُم مِّن بَعْدِ إِيمَٰنِكُمْ كُفَّارًا حَسَدًا مِّنْ عِندِ أَنفُسِهِم مِّن بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُمُ الْحَقُّ ..... (البقرہ ۲: ۱۰۹) (اہل کتاب میں سے اکثر لوگ یہ چاہتے ہیں کہ کسی طرح تمہیں ایمان سے پھیر کر پھر کفر کی طرف پلٹا لے جائیں۔ اگرچہ حق ان پر ظاہر ہو چکا ہے)۔

اسی طرح دوسری سورت میں افکار و خیالات میں دیدہ و نادیدہ تشکیک وارتیاب پیدا کرنے والوں سے خدا کی پناہ میں آنے کے لیے کہا گیا ہے اور یہ وسوسہ اندازی بھی منافقین و یہود ہی کا خاصہ ہو سکتی ہے جو زیادہ تر مدینہ اور اس کے گردونواح میں بستے تھے۔ بخلاف کفار کے کہ وہ کھلے دشمن تھے انہوں نے آپ کی راہ روکنے کے لیے جو بھی ہتھکنڈے استعمال کیے کھلے بندوں کیے اور یہ ہتھکنڈے اسی قسم کے تھے جو ایک دُنیادار طاقتور دشمن کے ہوتے ہیں۔ وہ نہ تو از قبیل وسوسہ اندازی تھے اور نہ ہی ان پر مذہبی رنگ چڑھا ہوا تھا اس کے علاوہ ہر دو سورتوں کا اسلوب بیان بھی مکّی سے زیادہ مدنی سورتوں کے اسلوب سے ملتا جلتا ہے۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مدنی زندگی کے بھی درمیانی دَور میں یہ سورتیں نازل ہوئیں کیونکہ مذہبی طبقوں کو ان وسیسہ کاریوں، وسوسہ اندازیوں اور حسد کی ضرورت اُسی وقت محسوس ہوئی ہو گی جب ان کی تمناؤں اور کوششوں کے علی الرغم اسلام ترقی کرنے لگا، حضورؐ کے ماننے والوں اور جاں نثاروں کی تعداد میں اضافہ ہونے لگا۔ ابتدا میں انہوں نے اس خطرے کو بے اعتنائی سے دیکھا ہو گا اور آخری دَور میں اس "سیلاب بلا" کا روکنا ان کے بس کی بات نہ رہی تھی۔ چنانچہ روایات سے بھی ثابت ہوتا ہے کہ یہ سورتیں ۵ھ کے قریب نازل ہوئیں۔

جس طرح جسمانی لحاظ سے انسان اپنی تمام تر تدبیروں کے باوجود ہر وقت قدرتی حوادث اور اپنے بنی نوع کی سازشوں کی زد میں ہے۔ خدا کی پیدا کردہ ہر چیز سے جاندار ہو یا بے جان

سے اسے نقصان پہنچ سکتا بلکہ جان کے لالے بھی پڑ سکتے ہیں۔ رات کی تاریکیاں نہ معلوم اس کے لیے کتنی مضرتیں اپنے اندر چھپائے بیٹھی ہیں۔ اس کے کتنے ہی دشمن علمِ سفلی کو اس کے خلاف استعمال کر سکتے ہیں۔ اس کی صلاحیتوں اور کمالات پر جلنے والے کسی وقت بھی اس کے لیے مشکلات کھڑی کر سکتے ہیں۔

سی طرح اس کے قلب و ذہن کو بھی ہر وقت پسِ پردہ سرگرمِ عمل شیطانی و ملحدانہ قوتوں کے اُٹھائے ہوئے فکری تشکیک وارتیاب کے طوفانوں کا بھی سامنا کرنا پڑتا ہے۔ انسانی قلب و فکر اس پرِ کاہ کی طرح ہے جو ہر وقت آندھیوں کی زد میں ہو کر جدھر چاہیں اُسے اُڑا کرلے جائیں۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: مثل القلب کریشۃ بارض فلاۃ یقلبھا الریاح ظھر البطن (مسند احمد) کہ انسان کے قلب کی مثال اس پَر کی سی ہے جو کسی بیابان میں پڑا ہوا ور آندھیاں اُسے اِدھر سے اُدھر اُڑاتی پھریں۔

حضرت انسؓ سے مروی ہے کہ آپؐ اکثر یہ دُعا مانگا کرتے کہ یا مقلب القلوب ثبت قلبی علی دینک کہ اے دلوں کے پلٹنے والے! میرے دل کو اپنے دین پر جمائے رکھ۔ اس پر صحابہؓ نے سوال کیا۔ اے اللہ کے رسولؐ! ہم آپ پر اور آپ کی تعلیمات پر ایمان لا چکے۔ کیا آپ کو ہمارے بارے میں (اب بھی) کوئی خدشہ ہے؟ آپؐ نے فرمایا: ہاں! کیونکہ دل اللہ تعالیٰ کی دو انگلیوں کے درمیان ہے۔ وہ انہیں جیسے چاہتا ہے، اُلٹ پلٹ کرتا ہے۔

حضرت عبداللہؓ بن عمرو بن عاص سے حضورؐ کا یہ قول مروی ہے کہ تمام انسانوں کے دل، خدا کی دو انگلیوں کے درمیان ہیں۔ وہ انہیں جس طرح چاہے پھیر سکتا ہے۔ اس کے بعد آپ نے دُعا کی کہ اللّٰھم مصرف القلوب صرف قلوبنا علی طاعتک کہ اے دلوں کے پھیرنے والے اللہ! ہمارے دلوں کو اپنی اطاعت و فرمانبرداری کی طرف ہی پھیرنا۔

ایسے میں انسان کا ظاہر و باطن اگر محفوظ رہ سکتا ہے تو صرف اللہ ہی کے فضل و کرم اور اس کی نصرت و ہدایت سے اور یہ دونوں سورتیں ایسے ہی وقت۔ خدا سے دستگیری طلب کرنے کی دُعائیں ہیں۔ اور ترتیبِ تدوینی میں ان دونوں سورتوں کو قرآن مجید — کتابِ ہدایت — کے آخر میں لانے کی حکمت غالباً یہی ہے کہ چراغِ مصطفوی اور شرارِ بولہبی کے درمیان اس ازلی و ابدی کشمکش میں بندۂ مومن شرارِ بولہبی کی جسمانی و فکری دونوں مضرتوں سے محفوظ رہے۔

کیا وجودِ باری تعالیٰ کا ثبوت ممکن ہے؟

جناب پروفیسر سید محمد سلیم صاحب

علامہ اقبال نے لکھا ہے کہ وجود باری تعالیٰ کے ثبوت میں یورپ کے حکماء نے تین دلیلیں دی ہیں۔ دلیل علت، دلیلِ غایت اور دلیلِ وجود۔ دلیلِ علت اور دلیلِ غایت کے متعلق علامہ اقبال لکھتے ہیں کہ ان پر کئی منطقی اعتراضات وارد ہوتے ہیں۔ دلیلِ وجودی پر انہوں نے کانٹ کا اعتراض نقل کرایا ہے۔ گویا یہ دلیل بھی نامقبول ہے۔ میں اس مختصر سے مضمون میں دلیلِ وجودی پر گفتگو کرنا چاہتا ہوں۔

دلیلِ وجودی کا بیان فرانسیسی فلسفی ڈیکارٹ (۱۵۹۶ء-۱۶۵۰ء) نے اس طرح دیا ہے:

"جب ہم کسی صفت کا اثبات کرتے ہیں تو فی الحقیقت ہم اس صفت کے وجود کا اقرار کرتے ہیں۔ اس لیے جب ہم خداوند تعالیٰ کا لفظ بولتے ہیں تو ہم خداوند تعالیٰ کا اثبات کرتے ہیں۔ اس کے وجود کا اقرار کرتے ہیں۔ خداوند تعالیٰ واجب الوجود ہے"۔

یہ دلیل وجودی قیاسی ہے۔

جرمن فلسفی کانٹ (۱۷۲۴ء — ۱۸۰۴ء) نے اس دلیل پر اعتراض کیا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ تصور اور وجود کے درمیان وسیع خلیج حائل ہے۔ اس کو پاٹنے کے بعد ہی وجود کا اثبات کیا جاسکتا ہے۔ پھر وہ ایک مثال کے ذریعہ اپنی بات سمجھاتا ہے۔

اگر کوئی شخص تصور کرے کہ اس کی جیب میں تین سو روپے ہیں تو کیا یہ روپے اس کی جیب میں موجود ہو جائیں گے؟ اہلِ مغرب یہ سمجھتے ہیں کہ خدا کے وجود پر اب کوئی دلیل نہیں ہے۔ حالانکہ ایک اور دلیل ہے۔

علم کا دروازہ حواسِ خمسہ ہیں۔ ساری معلومات انھی ذرائع سے حاصل ہوتی ہیں جتنی معلومات کی ترقی یافتہ شکل معقولات ہیں۔ اس طرح ہر قسم کی معلومات کا سرچشمہ حواس سے حاصل شدہ معلومات ہیں۔ یہ بات بالکل صحیح ہے۔ لیکن چند اُمور کا ادراک ہمیں حاصل ہے اور وہ علم حواس کے ذریعے حاصل شدہ نہیں ہے۔ ہم سب کو اپنی ذات کا، اپنے وجود کا علم ہے مگر یہ علم کسی حاسہ کے ذریعے حاصل نہیں ہوا۔ بلکہ ہمارا یہ علم وجدانی ہے۔ ایک اور مثال وقت کی ہے۔ وقت کے گزرنے کا علم کسی حاسہ سے نہیں ہوتا۔ بلکہ یہ علم وجدانی ہے۔ ایک اور مثال علّت و معلول میں نتیجہ کو کلی اور آفاقی بنا دینا ہے۔ یہ ہمارے وجدان کا کارنامہ ہے، عقلِ قیاسی کا کارنامہ نہیں ہے، مگر اس کی وضاحت ضروری ہے۔

آگ جلاتی ہے، زہر مارتا ہے۔ یہ تجربات خواہ کتنے ہی بار کیے جائیں۔ یہ انفرادی اور جزئی رہیں گے۔ اور ہر تجربہ ماضی کا تجربہ رہے گا۔ اگر مقدمہ جزئی اور ماضی ہو تو منطقی اعتبار سے نتیجہ بھی جزئی اور ماضی ہونا چاہیے۔ مگر یہاں ہم تجاوز کر جاتے ہیں اور کہتے ہیں آگ جلاتی ہے (ماضی، حال، استقبال)، زہر مارتا ہے۔ (ماضی، حال اور استقبال) یعنی جزئی کو کلی بنا دیا۔ مؤثر بہ ماضی کو مؤثر بہ حال اور استقبال بنا دیا۔ اس تجاوز عن الحدود کے لیے ہمارے پاس کوئی سند نہیں، کوئی جواز نہیں۔ لیکن علّت و معلول کی کروڑوں مثالوں میں ہم یہی کچھ کرتے ہیں۔ سائنس کی ساری عمارت اسی طرزِ عمل کی آئینہ دار ہے۔ ایسا ہم کیوں کرتے ہیں؟ اس کا جواب کسی فلسفی، کسی مفکر کے پاس نہیں ہے۔ ہم مسلمان قرآن کی رہنمائی میں یہ کہہ سکتے ہیں کہ وجدانی طور پر ہم ایسا کرتے ہیں۔ ہماری فطرت میں اللہ تعالیٰ نے یہ طریقۂ کار ودیعت کر دیا ہے تاکہ خلیفۃ اللہ دنیا میں علوم و فنون کی ترقی کر سکے۔ یہ بات نہ ہوتی تو علوم کی ترقی رُک جاتی ورنہ محدود ہو کر رہ جاتی۔

یہاں سے دو بڑی اہم باتیں ہمیں معلوم ہوئیں: حسی قیاسی علم کے علاوہ علمِ وجدانی کا ایک

ذریعہ بھی انسان کے پاس موجود ہے۔ خواہ وہ کتنا ہی قلیل الاستعمال کیوں نہ ہو۔ دوسری بات یہ معلوم ہوئی کہ قیاسی علم کی کسوٹی یعنی منطق کی مخالفت کے علی الرغم حق وہی ہوتا ہے جو وجدانی علم کہتا ہے۔ اور انسان ہی پر اپنے عمل کی بنیاد رکھتا ہے۔

ان مقدمات کو ذہن نشین کر لینے کے بعد اب آیئے اصل مسئلے کی طرف۔ وجود باری تعالیٰ کا ثبوت۔

جس طرح وجدانی علم کے ذریعے سے انسان کو اپنے وجود کا علم ہے اسی طرح وجدانی طور پر ہر ہر فرد بشر کو خداوند تعالیٰ کا —— ایک مافوق ہستی کا علم ہے۔

علم قیاسی معقولات کی خداوند تعالیٰ کے متعلق بلند ترین پرواز یہ ہے کہ وہ "لا ادری" "میں نہیں جانتا" کہہ دے۔ کوئی مفکر اور فلسفی آج تک ایسا نہیں گزرا جس نے خدا کے عدم وجود کو ثابت کیا ہو۔ اب رہا سوال عدمِ علم کا، تو عدم علم عدمِ وجود کو لازم نہیں ہوتا۔ کروڑوں انسان "جزیرہ ہیٹی" سے ناواقف ہیں، مگر ان کے نہ جاننے سے لازم نہیں آتا کہ "جزیرہ ہیٹی" کا وجود نہیں ہے۔ اس لیے اگر فلسفی لا ادری پر آکر رک جاتے ہیں تو اس سے یہ کب لازم آتا ہے کہ خداوند تعالیٰ کا وجود نہیں ہے۔

خداوند تعالیٰ کے وجود کا علم ہمیں وجدانی طریقہ پر حاصل ہے اور خداوند تعالیٰ کا علم ہمیں انبیاء کرام کے ذریعے سے حاصل ہوا ہے۔ اُن کو ایک نیا ذریعہ علمِ وحی حاصل ہے جو قیاسی اور معقولات سے بالکل مختلف ہے۔

جرمن فلسفی کانٹ کا اعتراض تصوری حس پر تھا، تصوری وجدان پر نہیں تھا۔ اور انفرادی پر تھا، کلی اور نوعی پر نہیں تھا۔

اب اگر کوئی پھر بھی ہٹ دھرمی اختیار کرتا ہے تو اُس کو پہلے اپنی ذات کا انکار کرنا چاہیے۔ علامہ اقبال نے ایک فلسفہ زدہ سید زادے کو یہی جواب دیا تھا۔

تری نگاہ میں ثابت نہیں خدا کا وجود
مری نگاہ میں ثابت نہیں وجود ترا

مطبوعات

مجموعہ رسائل ردّ الرّفضہ از جناب احمد رضا خان قادری بریلوی۔ ناشر: مرکزی مجلسِ رضا پوسٹ بکس ۲۲۰۶، لاہور ۱۵۔ بلاقیمت۔ بیرون جات کے حضرات کے لیے دو روپے کے ڈاک ٹکٹ بھیجیں۔

یہ کتاب جو فنِ مناظرہ کے دائرے میں آتی ہے اس دور سے متعلق ہے جب کہ غالب فضا مناظرانہ ہوا کرتی تھی۔ جو کچھ میں ناقص نظر سے دیکھ سکا، اپنے بزرگوں اور مخالفین کی مستند ہستیوں کے حوالوں کو مہارت سے جمع اور استعمال کیا گیا ہے۔ مولانا بریلوی کی نگاہ متعلقہ کتب پر خوب تھی۔

اس رسالہ کو پڑھ کر یہ اندازہ بھی ہوتا ہے کہ جناب مؤلف کے ذہن کی ساخت میں کتنا دخل مناظرانہ ماحول کا رہا ہو گا۔ اور پھر اسی ماحول کا کتنا اثر پورے حلقۂ ہم نوایاں میں پڑا۔ رسالہ کے اصل مواد کے برابر (تقریباً ۴۰ صفحے) تقدیم کے نام سے مولانا بریلوی اور شیعوں کے متعلق اُن کے نقطۂ نگاہ پہ لگا دینا عجیب سا لگا۔

بلاشبہ یہ مجموعہ رسائل آج بھی افادیت رکھتا ہے، مگر آج کے لیے پڑھنے لکھنے، تبلیغ کرنے اور تبادلۂ خیالات کرنے کا یہ رنگ زیادہ مؤثر نہیں رہا۔ ترتیب نو کی ضرورت ہے۔ کچھ لوگ دکھائیں کہ اصل مرکزی ہدف کیا تھا؟ اس کے لیے مرکزی عمل کیا سامنے تھا؟ بیچ بیچ میں جملہ ہائے "معترضہ" کی طرح کے جھمیلے خلل انداز ہوتے رہے۔ اور آج کے دور میں وہاں سے کونسا روشن پیغام ملتا ہے جس پہ پہلے بھی زور رہا ہو اور جس پر زور دینے کی آج بھی ضرورت ہو۔

میٹھی کونین	نتیجۂ فکر جناب ع - و - بنجار علیگ - ناشر: ادارہ ادب آر، ۴۰-۱۹

النور سوسائٹی - منصورہ، کراچی ۳۵ قیمت ۴۰/- روپے

"بنجارہ" صاحب کی زیارت ہوئی - وہ بنجار تخلص پر "قطعاً" نادم یا جھجکیلے نہیں ہیں - دھڑلے سے اپنے آپ کو بنجار کی حیثیت سے پیش کرتے ہیں - ایسے چار مصرعے بطور شہادت ؎

میں ہوں جیب غریب نسیب کا، میں مصب کی فصلِ بہار ہوں
مجھے زندگی سے غرض ہے کیا، میں رفیقِ کنج مزار ہوں
ترے گیسوؤں کی قسم مجھے، جو میں بال بھر بھی غلط کہوں
ترا منہ ہو کالا خدا کرے، مجھے دیکھ کالا بنجار ہوں

پورا مجموعہ کلام اسی انداز سے متنوع موضوعات پر طنز و مزاح کا سامان لیے ہوئے ہے اور شاعری کے آسمان پر ہر طرف مون سون کے "بنجارات" پھیلے ہوئے ہیں اور زمین پر بھی اپنا سا نہ بجا رہے ہیں - اور حضرت "بنجار" کونین تقسیم کرتے پھر رہے ہیں - بس صرف ایک شعر اور ؎

غیر جوتے ترے اٹھاتے ہیں تجھ کو کانٹیں گے یہ چیار ہی کیا

مختصر یہ کہ بنجار صاحب کے کلام کو مذاق نہ سمجھیے، ان کے کلام میں گہرائی بھی ہے، پہنائی بھی اور گیرائی بھی - ضرور لطف اندوز ہوں - امید ہے کہ بنجار بھی اتر جائے گا اور سامنے بھی "چڑھی ہے جو آندھی اتر جائے گی"

چاند، ستارے	یہ بھی بنجار علیگ کا مجموعہ کلام ہے (مختصر) باقی معلومات وہی ہیں -

قیمت: ۲۰/- روپے

اس میں خاص طور پر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی شان

میں شاعری پر زور دیجیے۔ مگر وہ "بخاری" والی بات بھی کچھ نہ کچھ شامل ہے۔ البتہ بخاری کی شاعری میں تبخیر ہے۔

سوءِ ادب فی حسن ادب بخاری علیگ صاحب نے اس مختصر کتاب میں (جو دراصل اُن کی کتاب "اُردو ادب اور اسلام" کا ایک باب ہے) نثر میں یہ سنجیدہ موضوع اُٹھایا گیا ہے کہ کس طرح اُردو شاعری کے خالص دینی موضوعات میں خرافات کا دخل ہوا۔ اوّلاً جنسیت زدہ درباری ماحول اور ہندو معاشرے کی غالب رسوم کو دکھایا گیا ہے اور پھر مشاہدہ کرایا ہے کہ کس طرح مرثیہ اور نعوت میں گھٹیا مواد داخل ہوا۔ نعت میں بہت سے شعراء نے حضورؐ کو خدائی مرتبے پر بھی رکھا ہے۔ اور بہتوں نے غزل کا معشوق بنا کے جسمانی حُسن کو مروّجہ استعاروں اور تشبیہوں سے پیش کیا۔ کئی شاعروں کے ہاں سرکارِ نبوّت کی ہستی (نعوذ باللہ) ایک عورت کی مانند نظر آتی ہے اور دوسروں کے ہاں ہندی انداز پر عورت کی طرف سے حضورؐ کے ساتھ عشق کا ایسے الفاظ میں اظہار کیا جاتا ہے جو مجاز کے لیے معروف ہیں۔ پھر دوسرا مضمون "نعتیہ شاعری پر ہندی ادب کے اثرات" نہایت اہم ہے۔ مختلف ممتاز نعت نگاروں کے مقبول کلام کا تجزیہ کر کے دکھایا گیا ہے کہ اسلامی حقائق یا اسلامی مقاصد کے لحاظ سے یہ کتنے قابلِ گرفت ہیں۔ بخاری صاحب کے اُصولِ بحث یا معیارِ فیصلہ پر تو آپ جو چاہیں بحث کریں۔ مگر وہ اتنے مخلص ہیں کہ بڑے چھوٹے کسی کی پروا حق بات کہنے میں انہوں نے نہیں کی۔

اِس مختصر سی کتاب کی قدر میں اس لیے کرتا ہوں کہ روشِ عام سے ہٹ کر کسی نے سوچا تو سہی اور کوئی بات تو چھیڑی۔ اب اختلاف کرنے والے شوق سے اختلاف کریں۔

اس کتاب کی قیمت ۱۷/- روپے ہے۔

(بقیہ صفحہ ۳)

اور فروغ میں اہم کردار ادا کیا۔ اسلامک ریسرچ انسٹی ٹیوٹ میں بھی خدمات انجام دیں۔

ان کی ساری عمر اس کوشش میں گذری کہ انسانیت کو فلاح اور بھلائی کا راستہ دکھایا جائے اور خصوصاً دنیا کو اسلام کی تعلیم دی جائے۔ وہ سمجھتے تھے کہ یہ مہم بغیر اس کے کامیاب نہیں ہو سکتی، خود مسلمانوں میں اسلامی تشخص کو اجاگر کیا جائے اور ان کے باہمی اختلافات کا خاتمہ ہو۔

ان کی خدمات کے دائرے وسیع ہیں اور ان کی دو کتابوں کا تذکرہ ضروری ہے: ایک "عروبا" جس میں عربیت کا تجزیہ ہے، دوسری کرسچین اینھکس (CHRISTION ETHICS) جس میں عیسائی اخلاقیات کا جائزہ ہے۔

مرحومہ اہلیہ فاروقی صاحب ان کی سرگرمیوں میں ان کی معاون اور سرگرم کار اور ہم خیال تھیں۔

اللہ تعالیٰ ان دونوں گراں مرتبہ ہستیوں کی مغفرت فرمائے، ان پر رحمتیں بھیجے اور ان کے ظالم قاتلوں اور اس قاتلانہ تخریبی ذہنیت رکھنے والے عناصر کو اپنے شکنجۂ عقوبت میں لے اور ان کے خلاء کو جلد پورا کرنے کے لیے ہمیں اور زیادہ بہتر ہستیاں عطا کرے۔ آمین

پاکستانی مِلّتِ اِسلامیہ

کے

اِتّحاد و اتفاق کا پانچ نکاتی فارمولا

—— آج کے اس دور میں ہماری سب سے بڑی کمزوری انتشار و افتراق ہے جب کہ ہماری قوّت کا حقیقی سرچشمہ اتّحاد و اتفاق ہے۔

—— اِتّحاد و اتفاق کی فضا بحال کرنے کے لیے پانچ بُنیادی اُصول یاد رکھیے۔

—— تحریکِ اسلامی کی شاخوں کے لیے اتحادِ ملّت کی مہم چلانے کا بہترین معاون و مددگار کتابچہ

اِتّحادِ مِلّت کے پانچ بُنیادی اُصُول

سیّد ابوالاعلیٰ مودودیؒ

یہ ۱۶ صفحات کا کتابچہ کثرت سے پھیلانے اور مسلمانوں میں اتحاد پیدا کرنے کی ضرورت ہے

ناشر

اِدارۂ ترجمان القرآن لمیٹڈ لاہور

رحمٰن مارکیٹ - غزنی سٹریٹ - اُردو بازار - لاہور

تفہیم القرآن — نیا ایڈیشن

تفہیم القرآن آفسٹ پیپر اور پرنٹنگ پیپر پر شائع کرنے کے بعد ولایتی گلیز پیپر پر شائع کی گئی ہے۔

— چھ ۶ جلدوں کی بجائے تین جلدیں
— سفید، چکنا اور مضبوط درآمدی کاغذ
— خوبصورت اور نفیس جلدوں سے مزیّن

ناشر

ادارہ ترجمان القرآن لمیٹڈ

رحمان مارکیٹ ۔ غزنی سٹریٹ ۔ اردو بازار ۔ لاہور